ذاکری کی دُوسری کتاب
حصہ اوّل
مؤلفہ
سید العلماء علامہ سید علی نقی صاحب قبلہ مجتہد العصر والزمان
ناشران
امامیہ کتب خانہ - لاہور
مغل حویلی - اندرون موچی دروازہ

اِس کتاب میں متوسط درجہ کے واعظین کے لحاظ سے عشرۂ محرم کی تاریخوں کے موافق ایسے مسودے درج ہیں جو نہ زیادہ طولانی ہیں نہ زیادہ مختصر۔ تمہیدی مضامین اور ربط مصائب لاجواب ہیں

ذاکری کی دُوسری کتاب (حصّہ اوّل)

مُصنّفہ

حضرت سیّد العلماء علّامہ سیّد علی نقی صاحب قبلہ مجتہد العصر دام ظلّہ

ناشران

اِمامیہ کُتب خانہ ۔ لاہور ۸

مغل حویلی ۔ اندرُون موچی دروازہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ سیّد الانبیاء والمرسلین واٰلہ الطیّبین الطّاہرین من یومنا ھٰذا الیٰ یوم الدّین ٥

اس کتاب میں دس مسوّدے عشرۂ محرم کی تاریخوں کے لحاظ سے اُن ذاکرین کے لئے لکھے جا رہے ہیں جو تھوڑا طولانی بیان کے عادی ہیں اور اوسط درجہ کی علمی استعداد بھی رکھتے ہیں "ذاکری کی پہلی کتاب" کے مسوّدوں سے ان مسوّدوں کا معیار ایک حد تک بلند رکھا گیا ہے۔
توفیق و اعانت خدا کے ہاتھ میں ہے اور اُسی کی بارگاہ میں اس کی پیشکش ہے۔ فتقبّل منّا انّک انت السّمیع العلیم۔

علی نقی النقوی عفی عنہٗ!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلسِ اوّل

محرم کی پہلی تاریخ

قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ فِیْ کِتَابِہِ الْمُبِیْنِ وَذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝

حضرت باری سُبحانہٗ کی جانب سے خطاب ہے حضرت رسولِ اکرمؐ سے۔ ارشاد ہوتا ہے "اے رسولؐ تم یاد دہانی کرتے رہو اس لئے کہ یاد کرنا اہلِ ایمان کے فائدہ کا باعث ہے۔"

کچھ نہیں بتلایا گیا کہ کیا چیزیں یاد دلائی جائیں۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ رسولؐ دنیا میں خلقِ خدا کی اصلاح کے لئے آئے تھے اور انسانیت کی تکمیل آپ کا مقصد تھا۔ اس لئے انہی باتوں کا یاد دلانا آپ کا فرض ہو سکتا ہے جو اس مقصد کے لئے ضروری قرار پاتی ہوں۔

اس قرآنی اجمال کی تفصیل معلوم کرنے کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ خود رسولؐ کے عمل کو دیکھا جائے۔ جن جن باتوں کے یاد دلانے میں رسالتمآبؐ نے اہتمام صرف کیا ہو سمجھئے کہ انہی کا یاد دلانا خدا کو منظور تھا اور وہی چیزیں

وہ ہیں جو ہدایتِ عالم کے لئے ضروری تھیں۔ کیونکہ رسولؐ کا انہماک یاددہانی میں یا آپ کے مقاصد زندگی میں یاد دلانے کا جزو اتنا نمایاں تھا کہ خود آپ کا لقب قرار پا گیا "ذکر" جس کے معنی یاد کے ہیں۔ ارشاد ہے لَقَدْ اَنْزَلْنَا اِلَیْکُمْ ذِکْرًا رَّسُوْلًا۔ ہم نے تمہاری طرف بھیجا یاددہانی کو جو رسولؐ ہے۔

اب دیکھئے کہ رسولؐ کی عمر کن چیزوں کے یاد دلانے میں بسر ہوئی۔

پہلے سب سے خدا کی یاد ہے یہ اصل اصولِ مذہب اور بنیادِ روحانیت ہے۔ انسان اپنے خدا کو یاد رکھے گا تو اُسے یہ احساس ہوگا کہ مجھے کن صفات کا حامل ہونا چاہئے۔ کونسا کام میں کروں جن سے خدا خوشنود ہو اور کونسا کام ترک کروں تاکہ خدا ناراض نہ ہو۔

اس ذکر کا درجہ اتنا بلند ہے کہ ارشاد ہوا فَاذْکُرُوْنِیْٓ اَذْکُرْکُمْ۔ تم مجھے یاد رکھو تو میں تم کو یاد رکھوں گا"۔ یُوں تو خدا ہر ایک ہی کو یاد رکھتا ہے اور کسی کو بھولتا نہیں۔ مگر مطلب یہ ہے کہ میں اپنی نگاہِ رحمت تم پر قائم رکھوں گا۔ کیا کہنا اُس بندہ کا جو اپنے خالق کے زیرِ نظر رہے اور جس سے اس کا پروردگار نگاہِ رحمت کو ہٹائے نہیں۔

دُوسری چیز آخرت کی یاد۔ اس کا اثر بھی انسان کے افعال و اعمال پر پڑتا ہے۔ وُہ انسان اپنے فرائض کو فراموش کر دیتا ہے کہ جو دُنیا کی آرائشوں میں مبتلا ہو کر آخرت کا خیال دل میں نہیں لاتا۔ مگر وُہ بندگانِ خدا جن کے پیش نظر ہے یہ کہ ہم کو یہاں کے بعد ایک دُوسرا عالم دیکھنا ہے جہاں اعمال کا حساب ہوگا اور اچھے بُرے کاموں کا بدلا

دیا جائے گا وُہ کبھی اپنی ہوا و ہوس کی رو میں آگے نہیں بڑھتے۔ انہیں ہر وقت خیال رہتا ہے کہ ہمارے کیا فرائض ہیں اور ہمیں کس طرح زندگی بسر کرنا چاہئے۔

خدا اور روزِ آخرت کے بعد کوئی چیز ایسی نہیں معلوم ہوتی کہ اعتقادی حیثیت سے انسان کے افعال و اعمال کی اصلاح کے لئے جس کے یاد رکھنے کی ضرورت ہو۔ مگر یاد رکھیئے کہ خداوندِ عالم کی ذات کی معرفت اور آخرت کا اعتقاد دونوں ایمان بالغیب ہیں اور وُہ انسان کے عقیدہ پر اثر قائم کر کے احساسِ فرائض تو پیدا کر دیتے ہیں مگر انسان کے فرائض اور اُس کے اعمال کی تکمیل کے لئے کسی عملی مثال یا نمونہ کا کام نہیں دے سکتے اس کے لئے ضرورت ہے ایک درمیانی ہستی کی جو خداوندی مقاصد کی نمایندہ ہو۔ مگر اسی عالمِ بشریت سے تعلق رکھتی ہو۔ یہ ہستی رسُولؐ کی ہے اس لئے خلقِ خدا کی بہبودی وابستہ ہے اس امر کے ساتھ کہ وُہ رسُولؐ کی شخصیت کو نہ بھولیں، کیونکہ اسی شخصیت میں اُن کو اطاعتِ الٰہی کی عملی تصویریں نظر آسکتی ہیں۔

اسلام نے رسُولؐ کی یاد قائم رکھنے کا بڑا انتظام کیا۔ ہر نماز کے ساتھ اذان و اقامت، اور دونوں میں رسُولؐ کی رسالت کا تذکرہ۔ خود نماز میں تشہد و سلام اور اُس میں بار بار رسُولؐ کا تذکرہ۔ یہ حضرت رسُولؐ کی یاد تازہ کرنے ہی کے لئے تھا۔

اس کے بعد جب ہم رسُولؐ کی تبلیغی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو

ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے اہلبیتؑ کی یاد تازہ کرنے میں بڑا اہتمام کیا ہے۔ بار بار مسلمانوں کو ہدایتیں بلکہ آخر وقت تک وصیتیں اہلبیتؑ کے ساتھ تمسک، پیروی اور محبت کی اسی لیئے تھیں کہ لوگ اہلبیتؑ کو بھُولنے نہ پائیں۔

اُدھر قرآن مجید کا ارشاد کہ ذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ "یاد دلائے جاؤ کیونکہ یاد رکھنا مومنین کے فائدہ کا باعث ہے"۔ اور اُس کے ساتھ رسُولؐ کا عمل اور آپ کی جانب سے اہلبیتؑ کے فضائل و مناقب کی یاد دہانی کا اس قدر اہتمام اس کے معنی یہ ہیں کہ اہلبیتؑ کو یاد رکھنے میں خود مسلمانوں ہی کی بہتری اور بہبودی ہے۔

اور حقیقت بھی یہ سب اہلبیتؑ معصومینؑ نے اپنے طرزِ عمل سے زندگی کے ہر شعبہ میں ایسی بلند مثالیں پیش کر دی ہیں جن کو یاد رکھنا خود ہماری زندگی کی بقا اور تکمیل کا باعث ہے۔ جمال میں ایک قدرتی دل کشی ہے۔ اور دلکشی ہی کا نتیجہ ہے محبّت۔ اور یاد رکھیئے کہ جمالِ صورت سے زیادہ جذّابیت جمالِ سیرت میں ہوتی ہے۔ اہلبیتِ معصومینؑ کی سیرت کا ہر خط و خالِ اتنا حسین ہے کہ جب اُس سیرت کا کوئی مطالعہ کرے گا تو محبّت پیدا ہونا لازمی ہے۔ اور اُن کے مصائب سے متاثّر ہو کر اشکبار ہونا ایک فطری چیز ہے۔ مگر اس کا ہماری زندگی پر یہ اثر ہونا چاہیئے کہ ہمارے دل میں اُن اوصاف کی عظمت پیدا ہو اور ہم اُن کی پیروی کی کوشش کریں۔

یہی وُہ حقیقی فائدہ ہے جو اس یاد سے ہم کو پہنچ سکتا ہے۔ اسی کو قرآن نے یاد دہانی کا مقصد قرار دیا ہے، اور اسی لئے رسُولؐ نے اس یاد دہانی کو ہمیشہ اپنی زندگی کا ایک اہم مقصد سمجھا۔

رسُولؐ نے اس میں بڑا اہتمام کیا۔ خود ان کے ساتھ انتہائی محبت کی اُن کی عظمت کا اظہار کیا اور اپنے اقوال سے دُوسروں کو محبت کا حکم دیا۔

• جو چیزیں غیر معمولی اور نادر ہوں وُہ دنیا کو زیادہ یاد رہتی ہیں۔ رسُولؐ نے اپنے اہلبیتؑ کے لیے ہمیشہ اس پہلو کا لحاظ رکھا۔

آپ نے نہیں سُنا ہو گا کہ کوئی باپ اپنی بیٹی کی تعظیم کرے۔ مگر رسُولؐ اپنی صاحبزادی سیدہ عالمؑ کی تعظیم کو کھڑے ہو جاتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ اس غیر معمولی برتاؤ ہی سے اُمّت کو اُن کی یاد رہے۔

امیرالمومنین حضرت علیؑ کی ہستی جنھیں اسلام کے لیئے مخصوص اہمیّت حاصل تھی اُن کے فضائل کا بے پایاں دفتر تمام و کمال اسی مقصد کا آئینہ دار ہے۔

اسلام کی تاریخ سے علیؑ کی ذات اس طرح وابستہ ہو گئی کہ اسلام کا کوئی واقعہ اُس وقت تک مکمل ہوتا ہی نہیں جب تک علیؑ کا تذکرہ نہ ہو۔

رسُولؐ کی بعثت کو یاد کیجئے تو سابق الاسلام کون؟ علیؑ بن ابیطالب

رسُولؐ کی ہجرت کو یاد کیجئے تو فرشِ خواب پر سونے والا کون؟ علیؑ بن

ابی طالب ! رسولؐ کے جہاد کو یاد کیجئے تو علمبردار کون ؟ علی بن ابیطالب
بدر کا تذکرہ ہو تو ولید اور شیبہ اور بہت سے بہادروں کو قتل کرنے والے علیؑ۔ اُحد کا ذکر ہو تو تمام ساتھیوں کے میدانِ جنگ چھوڑ دینے کے بعد عرصہ لافتیٰ کے شہسوار علیؑ۔
خندق کا ذکر ہو تو عمرو بن عبدود کے قاتل علیؑ۔
اور خیبر کا ذکر ہو تو مسلمانوں کی پے در پے شکستوں کے بعد قلعہ کے فاتح علیؑ۔
حدیبیہ کا ذکر ہو تو صلحنامہ کے لکھنے والے علیؑ۔
اور حنین کا ذکر ہو تو مشرکین کو آخری بار شکست دینے والے علیؑ۔ فتح مکہ کا ذکر ہو تو کعبہ کے بُت شکن علیؑ۔ اور تبوک کا ذکر ہو تو مدینہ میں رسولؐ کے جانشین علیؑ!
غرض ہر موقع پر علیؑ کی شخصیت اس طرح سے منضم ہے کہ بغیر حقیقت کو تبدیل کئے ہوئے وہ اس موقع سے جُدا ہو ہی نہیں سکتی۔
یہ بھی خیال کیجئے کہ عام مجمع سے کسی ایک کا مستثنیٰ ہو جانا اور نوادر میں داخل ہو جانا یہ بھی اُس کے یاد رہنے کا ضامن ہے۔
علیؑ رسالت مآبؐ کے زمانہ کے تمام لوگوں میں سے اکثر خصوصیات میں مستثنیٰ ہی نظر آتے ہیں۔
اسلام کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کی پیشانی کبھی بتوں کے سامنے خم نہیں ہوئی اس لئے "کرم اللہ وجہہ" کے الفاظ ان کے لئے مخصوص ہو گئے۔

(جہاد کو دیکھئے تو انہی کے قدم کبھی میدانِ جنگ سے ہٹے نہیں -
اس لئے کرّار غیر فرار کا لقب پا گئے -
مسجد کے دروازوں کا بند ہونا دیکھئے تو سب کے دروازے بند ہو گئے
تھے - صرف علیؑ کا دروازہ ایسا تھا جو بند نہیں ہوا -
آیت نجویٰ کی شانِ نزول کو ملاحظہ فرمائیے تو معلوم ہو گا کہ اس آیت
کے بعد کسی نے رسولؐ سے آکر مکالمہ نہیں کیا سوائے علیؑ بن ابی طالب کے
اب کیا ممکن ہے کہ علیؑ کی ذات کو اسلام فراموش کر دے
اور مسلمانوں کو وہ یاد نہ رہے -
مخصوص مرحلے ایسے جو اسلام کی تاریخ میں نمایاں ہیں اُن میں
اہلبیتؑ کو رسولؐ نے اپنے ساتھ رکھا یہاں تک کہ مباہلہ کا موقع جبکہ
حق و باطل کا رُوحانی مقابلہ تھا - اس وقت رسُولؐ نے اہلبیتؑ کو
الگ نہ کیا - یہ سمجھنا بالکل غلط ہے کہ رسُولؐ کی دُعا آمین کی محتاج
تھی - مگر پھر بھی حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہُوا فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ
اَبْنَآءَنَا وَ اَبْنَآءَکُمْ وَ نِسَآءَنَا وَ نِسَآءَکُمْ وَ اَنْفُسَنَا وَ
اَنْفُسَکُمْ - اے رسُولؐ! نصاریٰ سے کہو کہ ہم بلائیں اپنی اولاد
کو اور تم بلاؤ اپنی اولاد کو - ہم اپنی عورتوں کو اور تم اپنی عورتوں کو - ہم
اپنے نفسوں کو تم اپنے نفسوں کو -
آیت کے الفاظ میں وسعت تھی مگر اولاد کی جگہ رسُولؐ کے ساتھ
صرف دو بچے تھے حسنؑ اور حسینؑ - عورتوں کی جگہ پر صرف ایک سیّدہؑ

عالم اور نفسوں کی جگہ صرف ایک علیؑ ۔

معلوم ہوتا ہے کہ صرف یہی ذاتیں تھیں جو رسولؐ کا سرمایہ اور اسلام کی بضاعت تھیں۔ ان کو ساتھ لے جا کر یہ دکھلایا گیا کہ اگر اسلام پر کوئی مصیبت آئے گی تو یہی لوگ ہیں اسلام کو بچانے والے ہو سکتے ہیں

نواسوں کے ساتھ رسولؐ اللہ جس جس طرح اظہارِ محبت کرتے تھے وہ سب کو معلوم ہے۔

رسولؐ سجدے میں ہیں اور حسینؑ گئے تو وہ بلند مرتبہ ذات سجدے سے سر نہیں اٹھاتی۔ خطبہ پڑھ رہے ہیں اور حسینؑ دامن تھامے الجھ کر زمین پر گر پڑے تو رسولؐ خطبہ قطع کرتے ہیں۔ حسینؑ کو خود اٹھا کر اپنے ساتھ منبر پر لے جاتے ہیں۔

یہ سب اس لئے تھا کہ دنیا ان کو فراموش نہ کر سکے۔ ان کو یاد رکھے کیونکہ ان کی یاد ہی میں اسلام کی بقا مضمر ہے۔

مظلومِ کربلا امام حسینؑ کے المناک کو جو ائمہ معصومینؑ نے یاد دلانے کی انتہائی کوشش کی اس کا منشاء بھی یہی تھا۔

جب ہم ان کے تذکرے کریں گے ان کے کارنامے ہماری آنکھوں کے سامنے آئیں گے۔ اس سے ہماری زندگی کی اصلاح ہوگی۔

خصوصیت سے یہ زمانہ ان کی یاد کو تازہ کر دیتا ہے

محرم کا چاند آسمان پر نمودار ہوتے ہی حسینؑ کا تذکرہ دلوں کو بے چین کرنے لگتا ہے۔ وہ حسینؑ جنہوں نے اپنے نانا کی امت کے

لئے اپنا بھرا گھر لٹا دیا۔ جنہوں نے شریعت اسلام کی حفاظت کے لئے
اپنی کھیتی تاراج کرادی۔ وہ حسینؑ جنہوں نے مرجانا گوارا کیا مگر ایک
فاسق و فاجر کی بیعت گوارا نہ کی۔

یہ ان ہی حسینؑ کے ماتم کا زمانہ ہے۔

ہم ان کو یاد کرنے کے مختلف سامان کرتے ہیں۔

ہمارے عزاخانوں کو دیکھئے۔ سب سے پہلے آپ کو زمین پر صف
بچھی ہوئی دکھائی دے گی۔ یہ بتاتی ہے کہ ہم اس مظلوم کا ماتم کرتے ہیں جس
کی کربلا میں صف ماتم نہیں بچھ سکی۔

کون تھا صف ماتم بچھانے والا۔ بہنیں، بیٹیاں اور تمام اہل حرم تو
دشمنوں کے ہاتھوں قید ہو گئے تھے اور شہر بہ شہر پھرائے جا رہے تھے
صف ماتم بچھاتا کون اگر کسی کی آنکھ سے آنسو نکل جاتا تو اسے نوک نیزہ
سے اذیت دی جاتی تھی۔

تعزیہ خانے کے اندر آپ کو ضریح نظر آئے گی اور ضریح کے دونوں
طرف تعزیئے دکھائی دیں گے۔ یہ ضریح حقیقۃً قبر سے مشابہ ہے اور تعزیہ
روضہ کے بیرونی حصہ کی شبیہ ہے۔ یہاں اعلان ہوتا ہے اندر آپ کو تربت
کا نشان بھی ملے گا۔ معلوم ہوتا ہے تیرہ صدیوں کے بعد بھی شیعوں کے
دل پہ داغ ہے کہ افسوس حسینؑ کو مرنے کے بعد تین دن تک دفن ہونا
نصیب نہیں ہوا۔

عمر سعد نے تو اپنے کشتہ ہائے نجس کو تو دفن کیا اور ان پہ نماز جنازہ

پڑھی وَتَرَكَ الْحُسَيْنَ وَاَصْحَابَهٗ۔ "حسینؑ اور اصحابِ حسینؑ کی لاشوں کو یُوں ہی زمین گرم پر چھوڑ دیا"۔

وارثوں میں کون پاس تھا جو دفن و کفن کرتا۔ آخر چند اہلِ قریہ کو رحم آیا۔

زیارتِ ناحیہ میں ہے اَلسَّلَامُ عَلٰی مَنْ تَوَلّٰی دَفْنَهٗ اَهْلُ الْقُرٰی۔ "سلام اُس بےکس پر جسے دیہات والوں نے رحم کھا کر دفن کر دیا"۔

تعزیہ خانوں میں علم بھی ہوتے ہیں۔ یہ یاد دلاتے ہیں کہ ہمارا سب سے بڑا مقدس علم نہر کے کنارے علمدار کے مارے جانے سے گرا دیا گیا تھا، تو دُنیا یہ نہ سمجھ لے وُہ علم اب پست ہو گیا۔ نہیں۔ وُہ علم بلند ہے اور جب تک ہماری جان میں جان باقی ہے اِس علم کو یُونہی بلند رکھیں گے۔

ایک علم مخصوص حضرت عباسؑ کے نام سے نامزد ہوتا ہے اس میں مشک بندھی ہوئی ہوتی ہے۔ اس سے یاد آتا ہے کہ یہ اُس بےکس کا ماتم ہے جس کو تین دن تک پانی نہ ملا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تک پیاس سے جاں بلب تھے۔ یہ علمدار ہی کا کام تھا کہ اس سخت موقع پر بھی سقائی کے فرض کو انجام دیا۔ افسوس اس پانی کے لئے عباسؑ کا خون بہہ گیا، اور اطفال حسینؑ پیاسے رہ گئے۔

اس عزاداری کے زمانہ میں ہمارے در و دیوار مرقعِ غم ہوتے ہیں۔ اچھی پوشاکیں اور زیب و زینت کے سامان الگ ہو جاتے ہیں۔ سب سیاہ پوش نظر آتے ہیں۔ عورتیں چوڑیاں توڑ ڈالتی ہیں، زیور اُتار

دیتی ہیں اُس طرح جیسے والی و وارث کا غم کیا جاتا ہے؛ اور اس میں کیا شبہہ ہے کہ حسینؑ ہمارے دین و دُنیا کے بادشاہ تھے۔ اُن کا غم ضرور اسی طرح کرنا چاہئے۔ مگر ان باتوں کو نمائشی نہ ہونا چاہئے۔ ہماری آنکھوں کے سامنے صفِ ماتم ہے تو ہمارے دلوں میں بھی صفِ ماتم بچھی ہو۔ حسینؑ کی ضریح ہم رکھتے ہیں اس آرزو میں کہ ہم نے قبر نہ بنائی تو اگر کوئی مظلوم ہمیں بے گور و کفن سُنائی دے تو ہمارا دل تڑپ جائے۔ یہ کیا کہ ہم زندگی تک تو ایک انسان کی عزت کرتے ہیں اور مرنے کے بعد اُس کی لاش سے الگ بھاگتے ہیں۔ شریعت نے تو موت کے بعد ایک مسلمان کے حقوق اتنے رکھے ہیں جتنے زندگی میں نہیں ہیں۔ مشایعت جنازہ میں، تابوت کو کاندھا دینے میں، ہماری بے توجہی افسوسناک ہے۔

ہم علم اپنے عزاخانوں میں رکھتے ہیں تو ہمیں ہر وقت حق کی حمایت کا علمبردار بھی رہنا چاہئے۔ ہم اگر سیاہ پوش ہیں تو اس لباس میں حُسن و خوشنمائی اور وضعداری کا خیال نہ کرنا چاہئے۔ ہماری عورتوں نے زیور اُتار ڈالے تو سیاہ رنگ کے پیچھے، کرنبھول اور مختلف صورتوں سے آرائش کا خیال ترک کر دینا چاہئے۔

بچوں کو ہم قیدی بناتے ہیں۔ اس سے یہ یاد دلانا منظور ہے کہ حسینؑ کے لٹے ہوئے قافلہ کا قافلہ سالار حسینؑ کے بعد اس طرح قید ہوا تھا کہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں، پاؤں میں بیڑیاں، گلے میں طوقِ خاردار تھا۔

مگر اس سے ہمارے افراد میں یہ جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ حق کی حمایت

میں قید و بند کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ مگر ہتھکڑیاں اور بیڑیاں سونے چاندی کی پہنا کر دولتمندی کا ثبوت دینے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمارے بچوں کو یہ زیور لوہے کا ہی پہننا چاہئے۔

امام حسینؑ نے ہماری ہدایت ہی کے لئے اپنا گھر بار لٹا دیا۔ کیا تھا اگر آپ یزید کی بیعت کر لیتے یہ کہ اس صورت میں حق پر باطل کا پردہ پڑ جاتا، اسلام کے اصلی قوانین اور احکام محو ہو جاتے، اور دُنیا اُن کو فراموش کر دیتی۔ حسینؑ نے جان دے دینا گوارا کیا مگر اس کو گوارا نہ کیا۔ پہلی قربانی تو آپؑ نے اس کے لئے یہی کی کہ وطن کو چھوڑ دیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ امامؑ کو مدینہ کی طرف کشش صرف وطن ہونے کے لحاظ سے نہ تھی بلکہ نانا کا مزار، ماں کی قبر اور بھائی کی لحد بھی وہاں تھی۔ ان سب سے جُدا ہونا امامؑ کو بہت شاق تھا۔ چنانچہ اُس شب کو جس کی صبح ہوتے ہوتے آپ مدینہ کے باہر نکل چکے تھے۔ آپ نے صرف انہی قبروں سے رُخصت ہونے کے لئے مخصوص کیا۔

نہیں کہا جا سکتا کہ اس موقع پر آپ کے تاثرات کیا تھے مگر تاریخ اتنا بتلاتی ہے کہ روضۂ رسولؐ پر آپ کی حالت بہت مضطرب ہوئی۔ یہاں تک کہ خواب میں رسول اللہؐ کو دیکھا اور کہا دیکھئے آپ کی اُمّت کے ہاتھوں مجھے کن مشکلات کا سامنا ہے۔ نانا اب تو مجھے آپ اپنی قبر میں لے لیجئے اور دُنیا میں واپس جانے کا موقع نہ دیجئے۔

رسالت مآبؐ نے اپنے فرزند کو آئندہ کے واقعات کی اطلاع دی اور حسینؑ شہادت کے مرحلے کو طے کرنے پر بالکل آمادہ ہو کر

بیدار ہوئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ حسینؑ روضۂ رسولؐ سے جدا ہو کر کربلا کی طرف کیا چلے کہ رسولؐ قبر مطہر سے برآمد ہوئے۔ حسینؑ کا کربلا پہنچنا، فوجوں میں گھرنا، پانی کا بند ہونا، بچوں کا العطش کہنا، اصحاب کا جدا ہونا، عزیزوں کا شہید ہونا، شیر خوارؑ کا نشانۂ تیر ہونا، حسینؑ کا ہزاروں زخم کھا کر اسلام پر قربان ہو جانا، رسولؐ کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ جب ہی تو عاشور کے دن عصر کے وقت حضرت ام سلمہ نے خواب میں دیکھا کہ رسولؐ تشریف لائے ہیں اس طرح کہ سر برہنہ ہیں۔ سر و ریش مبارک پر خاک پڑی ہوئی ہے۔ ام سلمہ نے سبب پوچھا۔ فرمایا میرا فرزند حسینؑ قتل ہوا۔ یہ میرے سر اور ریش پر خاکِ کربلا ہے۔ اِدھر ام سلمہ کو اس خواب سے اطلاع ہوئی اُدھر فاطمہ صغریٰؑ کی دیوار پر طائر آ کر بیٹھا جس کے پروں سے خون ٹپک رہا تھا گویا فاطمہ صغریٰ کو خبر دے رہا تھا کہ بیٹی ہو تمہارے باپ شہید ہو گئے۔!

اَلَا قُتِلَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا اَلَا ذُبِحَ الْحُسَیْنُ بِکَرْبَلَا۔

مجلسِ دوم

محرّم کی دوسری تاریخ

قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ وَھُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِیْنَ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ

تطہیر ۱-

جناب باری عزّ اسمہٗ قرآن مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ "خدا کا مقصد یہی ہے کہ تم سے نجاست کو دُور رکھے اے اہلِ بیتؑ اور تمہیں پاک قرار دے جو پاک قرار دینے کا حق ہے"۔

خطاب ہے اہلِ بیت سے۔ اور یہ بتایا اگرچہ نہیں گیا ہے کہ کس کے اہلبیت۔ مگر دُنیا مانتی ہے کہ مُراد اس سے رسُولؐ ہی کے اہلبیتؑ ہیں۔ اگر لفظ میں عموم یا اطلاق کا پہلو ہوتا تو یہ خصوصیت کہاں سے پیدا ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سب مانتے ہیں کہ اس میں عمومیت کا اطلاق نہیں ہے بلکہ یہ اشارہ کسی خاص گھر کی طرف ہے۔ مگر گھر کی تعیین میں نگاہ دھوکا کھاتی ہے۔ بہت سوں نے اُسے اینٹ گارے کا بنا ہوا ظاہری گھر سمجھ لیا۔ اس لئے جتنے اُس گھر کے رہنے والے ہوں سب کو تطہیر کا لباس پہنا دیا حالانکہ معصوم ہونے کا دعوٰی اُن سب کے لئے کوئی نہیں کرتا۔ انہوں نے گویا خدا کے ارادہ کو اتنا کمزور سمجھ لیا ہے کہ وُہ پُر زور الفاظ میں اپنے ارادہ کا اعلان کرے اور پھر مراد حاصل نہ ہو۔ اور اگر ارادہ سے مُراد صرف اُس کا حکم اور اُس کی مرضی ہے تو اس میں اہلبیت کی خصوصیت کیا۔ تمام دُنیا ہی کے لئے خدا یہ چاہتا ہے کہ وُہ پاک اور مطہر ہوں اور گناہوں کا ارتکاب نہ کریں۔ اس میں اہلبیت اور دُوسرے لوگ سب شریک ہیں۔ پھر آخر اہلبیتؑ کے لیئے اس پُر زور اعلان کا مطلب ہی کیا ہوا۔

پھر اس میں زور اتنا دیا گیا کہ پہلے اِنّما کا حصر جو بتلاتا ہے کہ الٰہی قوت

ایک مرکز پر مجتمع ہے۔ جیسے کوئی بادشاہ بلند آواز سے کہے کہ بس ہم یہی چاہتے ہیں یعنی اس کے خلاف کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کے بعد نجاست کے علیحدہ ہونے کا تذکرہ جو طہارت کے مرادف ہے کرنے کے بعد اُسے دوہری قوت دے دی گئی اس صراحت سے کہ تمہیں پاک رکھے۔ پھر اُس کی تکمیل کی گئی آخر میں تطہیرا کے لفظ کے ساتھ جس سے معنی پیدا ہوتے ہیں کہ جو آخری درجہ طہارت کا ہے وہ تمہارے لیے حاصل ہو۔ اس قدر کوشش اور اتنی جدوجہد۔ اور پھر اس کا نتیجہ یہ کہ تم بھی عام لوگوں کی طرح اس بات پر مامور ہو کہ گناہوں کے مرتکب نہ ہو اور بس۔ یہ "کوہ کندن وکاہ برآوردن" نہیں تو کیا ہے۔

کلامِ الٰہی کی بلاغت ہرگز اس کو برداشت نہیں کر سکتی۔

دھوکا دینے والی چیز اس آیت کا محل ہے جو قرآن میں نظر آرہا ہے اُدھر رسالت مآب کے ازواج کا تذکرہ، اِدھر رسولؐ کے ازواج کا تذکرہ، بیچ میں یہ آیت۔ ہر شخص اسے دیکھ کر یہی سمجھے گا کہ یہ آیت بھی انہی کے متعلق ہوگی۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ قرآن شانِ نزول کے مطابق مرتب نہیں ہوا ہے۔ اس میں جو مقدم آیتیں تھیں وہ مؤخر ہوگئی ہیں جو مؤخر تھیں وہ مقدم ہیں۔ اسی وجہ سے آیاتِ قرآن کے خود مطالعہ سے ناسخ اور منسوخ کا پتہ لگانا غیر ممکن ہوگیا ہے۔ نہیں معلوم ہو سکتا کہ کون حکم پہلے تھا جو اٹھ گیا اور کون حکم بعد کو آیا جو باقی رہا۔

وہ قرآن جو شانِ نزول کے مطابق تھا وہ امیر المومنین حضرت علیؑ

بن ابی طالبؑ کا تھا مگر اُسے اقتدارِ سلطنت نے منظور نہیں کیا وُہ آپ کے پاس ہی محفوظ رہا اور نگاہِ خلق سے جدا پردۂ غیبت میں مستور رہا۔

گویا قرآن اور اہلبیتؑ کا جو ساتھ کیا گیا تھا اُسے قرآن نے اس حیثیت سے بھی نباہ لیا کہ سلسلۂ اہلبیتؑ کی آخری ہستی نگاہوں سے غائب ہونے والی تھی تو قرآن بھی اپنی اصلی شکل میں جو شانِ نزول کے مطابق تھی نگاہِ خلق سے مخفی ہو گیا۔ سچ ہے لَنْ يَّفْتَرِقَا حَتّٰى يَرِدَا عَلَيَّ الْحَوْضَ

"یہ دونوں یعنی قرآن و اہلبیتؑ کبھی جُدا نہ ہوں گے یہاں تک کہ میرے پاس حوضِ کوثر پر وارد ہوں"۔ ہو گا قرآن ظاہر اور ضرور ہو گا مگر اُسی وقت جب پردۂ غیبت کا امام دُنیا میں ظہور کرے گا اور محمدؐ کی آن، محمدؐ کی شان، محمدؐ کے نشان کے ساتھ عالمِ کائنات کو اپنے نور سے روشن کرے گا۔ اُس وقت ہمیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ قرآن کی اصلی شان کیا تھی۔ ابھی تو ہم ہر آیت سے جُدا مطلب ضرور نکالتے ہیں اور وُہ ہمارے لئے واجب العمل ہے۔ مگر آیات کے جوڑ توڑ اور نظم و ترتیب سے ہم کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتے۔ ورنہ یہ تو آپ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ آیت تطہیر خود ایک مستقل آیت ہے مگر موجودہ ترتیب میں وہ مستقل آیت نہیں نظر آتی بلکہ ایک دوسری آیت کا جزو اور تتمہ بنا دی گئی ہے۔ اسی سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اُس کا اصلی محل یہ نہ تھا کہ جہاں وُہ رکھ دی گئی۔ پھر اب آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ اس کے پہلے اور اس

کے بعد ازواج کا تذکرہ ہے اس لئے اس سے بھی مراد ازواج ہی ہیں۔ رسولؐ نے آیت کی منزل کو چادر کی چار دیواری کھینچ کر بتا دیا کہ کہاں ہے۔ پوچھئے ام سلمہؓ سے کہ چادر میں کون کون لوگ تھے۔ وہ بتائیں گی کہ رسول اللہؐ کے ساتھ علیؑ تھے اور فاطمہؑ، حسنؑ تھے اور حسینؑ۔ یہ بھی دریافت کر لیجئے گا کہ آپ نے جب چادر میں جانے کا ارادہ کیا تو رسول اللہؐ نے کیا کہا تھا۔ وہ کہیں گی کہ رسول اللہؐ نے چادر کا گوشہ میرے ہاتھ سے کھینچ لیا اور کہا تمہارا انجام بخیر ہے مگر اس چادر میں تمہارا کام نہیں ہے۔ اب رسولؐ کی اس تصریح کے بعد کس کو حق ہے کہ وہ آیت دائرہ کو وسیع کرے اور اس میں اُن مخصوص ہستیوں کے علاوہ کسی کو داخل کر دے۔

حقیقتہً یہ قدرت کا اہتمام تھا کہ اُس نے جس طرح رسولؐ کے بلند اخلاق کی عظمت کا اظہار کیا ان الفاظ میں کہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ۔ "یعنی اے رسولؐ تم بڑے اخلاق کے درجہ پر فائز ہو"۔ تا کہ کسی کو ان کی پیروی میں عذر نہ رہے۔ اسی طرح اُس نے آپ کے اہلبیتؑ کی طہارت و عصمت کا تذکرہ کیا تا کہ رسولؐ کے بعد دُنیا ان کے نقشِ قدم پر چلے اور اُن کو رہنما تسلیم کرے۔

اگر ان میں جرم و خطا اور گناہ کا گزر ہوتا تو یہ ہرگز مکمل طور پر رہنمائی کے قابل نہ ہوتے۔ مگر ان کی محبت، ان کے ساتھ تمسک اور ان کی اطاعت کو فرض قرار دینا اس لئے ضرور تھا کہ ان کی

ہستیاں عملی حیثیت سے مکمل ہوں۔

یہی ضرورت تھی جس کی بناء پر رسولؐ نے ان کی تعریف و توصیف میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ کیونکہ وُہ جانتے تھے کہ ان پر نگاہوں کا پڑنا، ان کا تذکرہ باقی رہنا میرے مقاصدِ تبلیغ کی کامیابی کا ذریعہ ہے۔

خاندانِ عبدالمطلب سیادت کا مرکز تو تھا ہی مگر رسولؐ نے اپنے اہلبیتؑ میں سے ہر فرد کو مخصوص طور پر سیادت کی صفت سے متصف کیا اسی لیے کہ دُنیا ان کو سردار مان کر ان کے اقوال و افعال کی پیروی کرے۔ کبھی حضرت امیرالمومنین علی ابن ابی طالبؑ کے لیے ارشاد کیا اَنْتَ سَیِّدُ الْعَرَبِ تم تمام عرب کے سردار ہو" کبھی اپنی صاحبزادی فاطمہ زہراؑ کے لیے ارشاد فرمایا کہ وُہ سیّدۂ نساء العالمین ہیں۔ یعنی تمام دُنیا کی عورتوں کی سردار۔" کبھی نواسوں کے لیے فرمایا اَلْحَسَنُ وَ الْحُسَیْنُ سَیِّدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنَّۃِ۔ "حسنؑ اور حسینؑ دونوں جوانانِ اہلِ جنّت کے سردار ہیں"۔

الفاظ میں بالکل عموم ہے۔ جنّت کے حدودِ مملکت اور مردم شماری کو کون بتائے؟ پھر بھی اس میں تو کوئی شبہہ نہیں کہ انبیاءؑ و مرسلین اور شہداء و صدیقین سب یہیں کے رہنے والے ہیں۔ حدیث میں استثناء کسی کا نہیں ہے اس لیے از آدم تا ایں دم جتنے بھی افراد بہشت کے حقدار سمجھے جائیں سب حسنؑ اور حسینؑ

کے زیرِ نگین ہیں۔

بیشک متکلم عقلی طور پر مستثنیٰ ہوتا ہے اور حضرت علیؑ کے لئے اسی روایت میں یہ تتمہ بھی وارد ہُوا ہے کہ "وَ اَبُوْھُمَا خَیْرٌ مِّنْھُمَا" ان دونوں کے باپ ان سے بہتر ہیں۔" اس کے بعد جو جنت کا حقدار بننا چاہے وُہ ان شہزادوں کی سرداری قبول کرے۔ یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہ سرداری جنت میں جا کر ملے گی۔

• حقیقتہً اہل الجنۃ کے معنی ہیں وُہ لوگ جو اپنے اعمال کے لحاظ سے بہشت میں جانے کے لائق ہوں۔ لہٰذا نیک عمل لوگ اسی دُنیا میں اہل الجنۃ کے مصداق ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ حیاتِ مادی کی زنجیریں ان کو ابھی جنت میں داخل ہونے سے مانع ہیں۔

یہی طبقہ جو اہلِ جنت کا مصداق ہے وُہ ہو گا جس کے سرگروہ یہ دونوں بزرگوار ہیں۔

میں نہیں سمجھتا کہ نصِ امامت اس سے بڑھ کر کیا ہو گا؟

اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ بہشت کا استحقاق ان کی پیروی پر موقوف ہے۔ اور چونکہ جہاں تک آپ قرآن کا مطالعہ کریں یہ معلوم ہو گا کہ جنت کا استحقاق ایمان اور اعمالِ صالحہ سے پیدا ہوتا ہے اِس لیے سردار اہلِ جنت ہونے کا صرف یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ یہ ایمان اور اچھے اعمال کا تمام خلق سے زیادہ مکمل اور بہترین نمونہ ہیں۔ اور چونکہ اہلِ جنت میں ایسے بھی افراد ہیں جن کے دامنِ عمل پر گناہ کا دھبا نہیں، اس لیے ناممکن ہے کہ اہلِ جنت کے سردار اس صفت سے متصف

نہ ہوں۔ ضروری ہے کہ وُہ معصوم ہوں اور اُسی طرح پاک ومطہر ہوں جیساکہ مطہر ہونے کا حق ہے۔ یہی ہے وُہ منشا جسے آیتِ تطہیر بتلاتی ہے، اور یہی اس حدیث سے بھی ظاہر ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کا کمال محل شناسی اور اعتدال سے حاصل ہوتا ہے۔ مغلوب الغضب انسان ممکن ہے کہ بہت سے مواقع پر کارآمد اقدام بھی کرے جس پر دنیا خراج تحسین پیش کرے۔ مگر جب ایسا محل آئے گا جس میں حکمت ومصلحت، سکوت وچشم پوشی کا مشورہ دیتی ہو تو ایسے شخص کا نامناسب اقدام اُسے ہدف ملامت بنانے کا باعث ہوگا۔ اس بناء پر کہ اُس کے افعال و اعمال میں توازن نہیں قائم ہے۔ اس کی عقل غضب کی طاقت سے مغلوب ہے اس لیے وُہ موقع بے موقع قدم آگے بڑھا دیتا ہے۔

اسی طرح وُہ انسان جو طبعی حیثیت سے خاموش اور ساکن، حلیم اور متحمل ہے جس میں حوصلوں کا وجود ہی نہیں جس میں ولولوں کی پیداوار ہی نہیں ہوتی۔ یہ بہت سے موقعوں پر ایسا سکوت کرے گا جو انسانیت کی بارگاہ میں قابلِ قبول ہو۔ مگر جہاں عقل کا فتوٰے قدم بڑھانے کا ہو وہاں بھی یہ خاموشی ہی سے کام لے گا۔ یہ خاموشی اُس کی جرم ہوگی اور دُنیائے انسانیت اُسے بُرا کہنے پر مجبور ہوگی۔

انسانی کمال اعتدال کے محور پر گردش کرتا ہے۔ وُہ ہر محل پر اسی کے مطابق طرزِ عمل کا طلبگار ہے۔ یہی اخلاق کا نچوڑ اور تہذیب نفس کا سرچشمہ ہے۔ اگر آپ غور فرمائیے تو پیغمبرؐ اسلام کے یہ

دونوں نواسے حسنؑ اور حسینؑ اپنی مجموعی سیرت سے مکمل اخلاقِ انسانی کا نمونہ یا کتابِ اخلاق کے دو سنہری ورق ہیں۔

یوں تو تمام معصومینؑ کی زندگی اپنے اپنے دور میں اطاعت اور اتباع کی مستحق ہے۔ مگر امام حسنؑ اور امام حسینؑ ان دونوں بزرگواروں کو ایک ایسے انقلابی دور کا مقابلہ کرنا پڑا تھا جب اسلامی تہذیب و تمدن پر اقتدار سلطنت یا اموّیت کا لباس پہنایا جا رہا تھا۔ جب پیغمبرؐ اسلام کی سادہ تعلیمات کو مسخ کر کے کسرویت اور قیصریت کے سانچوں میں ڈھالا جا رہا تھا۔

اس وقت ضرورت اس بات کی تھی کہ اقدامات کو محدود بنا کر اسلام کے اصلی خط و خال اور نقش و نگار کو نمایاں کر دیا جائے۔

حسنینؑ کی مجموعی زندگی اس مقصد کی تکمیل میں صرف ہوئی اور آخر میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت سے یہ مقصد مکمل ہوگیا۔ اس کے بعد تمام ائمہؑ کا کام صرف اس کی حفاظت تھی اس لئے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے پیغمبرؐ اسلام کے ان دونوں فرزندوں کے اُسوۂ حسنہ کو جنہوں نے حق اور باطل کو امتیاز دینے میں اپنی پوری طاقت صرف کر دی۔

اس سلسلہ میں ایک نمونہ پیش کیا امام حسنؑ نے جس کا محل پہلے تھا اور دوسرا نمونہ پیش کیا امام حسینؑ نے جس کا محل بعد کو تھا۔ حسنؑ کی جگہ پر حسینؑ برسرِ اقتدار ہوتے تو وہی کرتے جو انہوں

نے کیا اور حسینؑ کی جگہ اگر امام حسنؑ ہوتے تو کربلا کے شہید وہی نظر
آتے ۔ یہ تو دُنیا والوں کی ناسمجھی ہے کہ وُہ موقع بے موقع آمادۂ
پیکار ہو جانے ہی کو شجاعت سمجھتے ہیں ۔ مگر شجاعت تو حقیقتہً یہ ہے
کہ انسان کی قوتِ غضبی اُس کے عقل کی ماتحت ہو ۔ جس وقت قدم
اُٹھانا مناسب ہو اور اقدام ضروری ہو اُس وقت وُہ اس طرح
آگے بڑھے جیسے اُس کے سینہ میں دل اور دل میں خوف و
اندیشہ پیدا ہی نہیں ہوتا ۔ اور جب اقدام مناسب نہ ہو تو اس
طرح سکوت کر جائے جیسے اس کے دل میں قوت اور بازوؤں
میں سکت پیدا ہی نہیں ہوئی ۔

اس صورت میں خاموشی جوہرِ شجاعت ہوگی جس طرح پہلی
صورت میں نبرد آزمائی ۔ خود رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے مکہ معظمہ میں عرصہ تک مصائب سہے اور آخر مخفی طریقہ پر وطن کو
چھوڑ دیا ۔ مدینہ چلے گئے ۔ اس حالت کو دیکھ کر ایک ناواقف انسان
شجاعت میں شک کر سکتا ہے ۔ مگر وہی رسُولؐ کی ہستی تھی جس نے
موقع آنے پر بدر، اُحد، خندق وغیرہ میں دشمنوں سے جنگ بھی
کی اور بڑے بڑے خطرناک موقعوں پر جب کہ ساتھ والوں
نے ساتھ بھی چھوڑ دیا تھا اُن کے پائے استقلال میں جنبش نہ
آئی ۔ ان لڑائیوں کو دیکھ کر غیر مسلم دُنیا یہ کہنے لگی کہ رسُولؐ
خونریز اور جنگجو تھے ۔ مگر ذرا اسی رسُولؐ کو پھر اس کے بعد صلحِ

حدیبیہ کے موقع پر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وُہ کیسے صلح پسند
انسان تھے۔

حضرت علیؑ بن ابی طالب ایک وقت ایسا آتا ہے، جب
رسولؐ کے ساتھ جہاد میں کارہائے نمایاں انجام دیتے ہیں اور
ملک سے فلک پر لافتیٰ الاّ علیؑ کا کلمہ پڑھوا لیتے ہیں۔ اور دُوسرا
وقت ایسا آتا ہے کہ پچیس۲۵ برس تک طرح طرح کی زیادتیوں
کو سہتے ہیں، اور تلوار نیام سے نہیں نکالتے ہیں۔ پھر ایک مرتبہ
ایسا موقع آجاتا ہے جب جمل اور صفین اور نہروان میں پھر خون
کے دریا بہا دیتے ہیں۔ اب ایسے انسانوں کو کوئی کیا کہے جنگ جو
کہے یا صلح جو۔

کچھ بھی نہیں۔ ان کے افعال جذبات کے ماتحت تھے ہی
نہیں۔ وُہ صلح کے موقع پر صلح جو تھے اور جنگ کے موقع پر
جنگ جو۔

یہی دونوں نمونے امام حسنؑ اور امام حسینؑ نے پیش کئے
دونوں اماموں کی سیرت مجموعی طور پر کمالِ انسانیت کی تصویر ہے
اور اس لئے پیغمبرؐ نے دونوں کو ملا کر سرداری کا عہدہ تفویض
کیا۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا ہے کہ ھُمَا اِمَامَانِ قَامَا
اَوْ قَعَدَا۔ "یعنی وُہ دونوں پیشوائے خلق ہیں خواہ کھڑے ہوں
اور خواہ بیٹھے ہوں"۔ صلح کر کے بیٹھ جانا امام حسنؑ نے اختیار کیا

اور مظلومانہ جنگ کے لیئے کھڑا ہو جانا امام حسینؑ کا راستہ تھا۔
اب یہ شناخت کرنے کی ضرورت ہے کہ کس موقع پر کس امام کے اتباع کا محل ہے اور اسی لیے ہر زمانہ میں علماؤ مجتہدین کی رہنمائی درکار ہے۔ ناواقف افراد ہر بات میں واقعۂ کربلا کی مثال پیش کر دیتے ہیں۔ انہیں سیّد الشہداءؑ کی عظیم قربانی اور اُس کے موقع کی اہمیت اور نزاکت کا احساس نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک گویا ہر شخص اپنے وقت میں حسینؑ ہے، اور ہر موقع اُس کے لیے کربلا ہے۔

امام حسینؑ نے جس موقع پر حق اور باطل کے آخری فیصلہ کے لیے قربانی کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ وقت وُہ تھا کہ صلح کے طریقہ کو آزمایا جا چکا تھا۔ شرائطِ صلح کی خلاف ورزی ہو چکی تھی۔ اور احتجاج کی منزلیں بھی طے ہو چکی تھیں۔ حسینؑ سے بیعتِ یزیدؑ یعنی باطل کی حمایت کا مطالبہ تھا، اور حسینؑ کو اس پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ بیعت کر لینا اسلامی شریعت کے ہمیشہ کے لئے مٹ جانے کا پیش خیمہ تھا اور امامؑ کے لیئے کوئی چارۂ کار باقی نہ رہا تھا۔ پھر بھی ظاہری طور پر حضرتؑ نے اپنی جان کی حفاظت کا بڑا سامان کیا۔
مکہ معظمہ میں پناہ لی جہاں جانوروں تک کو ستانا جائز نہیں ہے مگر افسوس وارثِ حرم کو حرم میں بھی پناہ نہ ملی۔ اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ اگر آپ مکہ معظمہ کو چھوڑ نہ دیتے تو اُسی پاک اور مقدس

زمین پر یہ خونِ ناحق بہایا جاتا۔ حسینؑ کو خانۂ خدا کی حُرمت اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ مکّہ سے بھی ہجرت کی اور کوفہ کا رُخ کیا۔ مگر یہاں ابنِ زیاد کا تسلّط ہو چکا تھا۔ ابھی امام حسینؑ راستہ میں تھے کہ دشمن کی فوج سامنے آتی نظر آئی۔ یہ حُر کا رسالہ تھا۔ جو ایک ہزار سواروں کے ساتھ آپ کو گھیرنے کے لئے آیا تھا۔

امامؑ نے حُر سے جو گفتگو کی اس میں بھی ارشاد فرمایا کہ میں جہاں سے آیا ہوں. وہاں مجھے واپس جانے دو یا مجھے کسی اور ملک کی طرف نکل جانے دو۔ حُر بھی اس پر کسی حد تک رضامند ہو گیا تھا۔ مگر افسوس مسلمان تو نبیؐ زادے کے خوُن کے پیاسے ہو گئے تھے۔ آ گیا ابن زیادعہ کا خط حُر کے نام کہ حُسینؑ کو آگے بڑھنے نہ دو۔ جہاں یہ خط تمہیں پہنچے وہیں پر حسینؑ کو روک لینا۔ اور دیکھو حسینؑ کو کسی نہر کے کنارے یا شاداب جگہ اُترنے نہ دینا بلکہ ریتی کے اُوپر خشک مقام پر ٹھہرنے پر مجبور کرنا۔

حُر اس خط کے پہنچتے ہی سدّ راہ ہُوا اور امامؑ کو آگے بڑھنے سے روکا۔ آپ کا امام کربلا کے جنگل میں اُترنے پر مجبُور ہو گیا۔ اصحابِ حسینؑ چاہتے تھے کہ خیمے نہر کے کنارے نصب ہوں مگر فوجِ حُر نے اسے کسی طرح گوارا نہ کیا۔ حسینؑ کے باوفا اصحاب کی تیوریوں پر بل آ گئے تھے۔ زہیر بن قین کہہ رہے تھے آقا بس ہمیں ان سے لڑ لینے دیجئے۔ مگر وُہ حسینؑ کا صبر و سکون اور

تحمل تھا کہ آپ نے فرمایا ہمیں جنگ میں ابتدا کرنا منظور نہیں خیمے
ہمارے ریتی پر برپا کردو۔

آج دوسری تاریخ محرّم کی ہے۔ آج ہی وہ دن ہے جب
آقا زمینِ کربلا پر وارد ہوئے۔ امامؑ نے اصحاب سے فرمایا ھٰھُنَا
وَاللّٰہِ مَحَطُّ رِجَالِنَا وَسَفْكُ دِمَائِنَا وَھَتْكُ حَرِیْمِنَا
"یہیں ہمارے اسباب اُتارے جائیں گے۔ یہیں تو ہمارے
خُون بہائے جائیں گے۔ یہیں ہماری حُرمت برباد کی جائے گی"۔
مختصر الفاظ نہیں ایک دفتر ہے حسینؑ کے مصائب کا جو کربلا کی
سرزمین پر وارد ہوئے۔ کیا میں بتلاؤں کہ اس سرزمین پر
کون کون سے خون بہائے گئے؟ اصحاب کے خون! عزیزوں
کے خون! حسینؑ کے کڑیل جوان علی اکبرؑ کا خون! برابر کے بھائی
عباس علمدار کا خون! اور ایک خون تو اس زمین پر ایسا بہا جس
کی نظیر تاریخ میں کبھی نظر نہیں آئی۔ اور وہ ششماہے بچّہ کا
خونِ ناحق ہے۔ مگر نہیں نہیں۔ یہ خون زمین پر نہیں بہا۔ اسے
تو حسینؑ نے اپنے چہرہ پر مل لیا۔ گویا یہ روئے شہادت کا غازہ
تھا۔ فرمایا اسی صورت سے میں اپنے نانا رسولؐ اللہ سے
ملاقات کروں گا۔

خود فرزندِ رسُولؐ کا خون اس سرزمین پر مختلف طرح سے
بہا۔ سینہ و پہلو کا خون، چہرہ کا خون، جبین کا خون اور سب سے

آخر میں قلب مبارک کا خون جس کے بعد امامؑ میں سنبھلنے کی طاقت نہ رہی۔ پُشتِ فرس سے زمین پر تشریف لائے اور اس کے بعد وُہ ہُوا جس سے زمین و آسمان تھرا گئے۔ سکینہؑ یتیم ہوئیں اور بی بیاں بے والی و وارث ہوگئیں۔ شاید اہلِ حرم کی مصیبت بھی حسینؑ کو یاد آگئی تھی جب ہی فرمایا کہ یہاں ہماری ہتک حُرمت ہوگی۔ دو جہان کی شہزادیاں جن کی ماں کا جنازہ رات کو اُٹھا تھا وُہ روزِ روشن میں خیمہ سے نکلنے پر مجبور ہوئیں۔

بیمار امامؑ دشمنوں کے ہاتھوں میں قید ہوئے اس طرح کہ فرما رہے تھے:-

اُقَادُ ذَلِیلاً فِی دِمِشْقَ کَاَنَّنِیْ مِنَ الذِّنْجِ عَبْدٌ غَابَ عَنْهُ نَصِیرُہٗ

مجھے اس ذلت سے قید کرکے دمشق میں لے جا رہے ہیں جس طرح غلام حبش و زنگبار کو لے جاتے ہیں۔ غلام بھی وُہ جس کا کوئی مددگار نہ ہو۔

مجلس سوم

محرّم کی تیسری تاریخ

قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ فِیْ کِتَابِہِ الْمُبِیْنِ وَھُوَ اَصْدَقُ الصَّادِقِیْنَ فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنِ

جناب باری عزّ اسمہٗ کا ارشاد ہے "تم مجھے یاد رکھو تو میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا۔ اور میرا شکریہ ادا کرو اور کفرانِ نعمت نہ کرو"۔ اس میں تمام خلق کو دعوت دی جا رہی ہے یاد رکھنے کی۔ کس کے؟ اُس ہستی کے جو خلعتِ وجود عطا کرنے والی، زندگی کی دینے والی ہے، بقائے زندگی کے سامان فراہم کرنے والی ہے، اور ہمارے نفس کے تار کی قائم کرنے والی ہے۔ اُسی نے اس گلشنِ رنگ و بُو کو سنوارا۔ اس کاشانۂ حُسن و دلکشی کو آباد کیا اور اس مرقعِ ہمہ تن جمال کی نقش بندی کی ہے۔ دہن میں زبان اور زبان میں طاقتِ گفتار اُس نے دی۔ آنکھ میں تل اور تل میں نور کا دریا موجزن اُس نے بنایا۔ سامعہ کے ہر پردہ کو نغموں کا مرکز قرار دیا اور دل و دماغ کو احساس و ادراک کی نعمتوں سے مالامال کیا۔ پھر کیا انسان اُسے فراموش کر دے گا؟ حالانکہ جدھر نظر اُٹھا کر دیکھئے اُسی کی کائنات آنکھوں کے

سامنے آئے۔ آنکھوں کو بند بھی کرے تو تاریکی کا لق و دق صحرا اُس کے نُور کا جلوہ گاہ معلوم ہو۔ زبان سے کہے بھی کہ وُہ نہیں ہے تو نفی کا نون شروع ہوتے ہی لفظ کن کے انجام کا پتہ دے۔ پھر بھی یہ انسان کی خود فراموشی دیکھیئے کہ وُہ کبھی کبھی خدا کے وجود کا منکر ہوتا ہے۔ انکار نہیں بھی کرتا تو عمل سے ثابت کرتا ہے کہ وُہ اُسے بھولا ہُوا ہے۔

اور اگر اُسے بھولتا نہ اور ہر وقت یاد رکھتا تو کیا ممکن بھی ہے کہ فرائض میں کوتاہی کرتا، بداعمالیوں کا مرتکب ہوتا، غرور و نخوت سے کام لیتا، اور خلق کو آزار پہنچاتا۔

انسان کا ظاہر باطن کا آئینہ دار ہے۔ اُس کے اعضاؤ جوارح دل و دماغ کے محکوم اور تابعِ فرمان ہیں۔ یہ وُہ سلطنت نہیں ہے جس میں بغاوت ہو۔ رعیت خود سری اور سرکشی سے کام لے۔ اور حاکم کا بس رعایا سے نہ چلے۔ یہاں تو دل و دماغ میں جو تصورات ہوں گے اور جو احساسات کارفرما ہوں گے اُن کے موافق عمل کا ہونا ناگزیر ہے ایک بچہ جو اپنے باپ سے واقعی ڈرتا ہے اُس وقت تک شرارت کرتا رہ سکتا ہے جب تک اُسے باپ کی عدم موجودگی کا علم ہو۔ ادھر اُس کو یہ خیال پیدا ہوا کہ باپ اُس کا آگیا، یا وُہ کہیں سے اُسے دیکھ رہا ہے، فوراً یہ خاموش ہو جائے گا۔ اس کے ہاتھ رُک جائیں گے اور یہ چُپ چاپ بیٹھ جائے گا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اپنے باپ کی موجودگی کا اس کو خیال پیدا ہو گیا ہے۔ پھر اگر ایک انسان واقعی یہ خیال پیشِ نظر رکھتا ہو کہ اُس کا

خالق اُسے دیکھ رہا ہے تو کیا ممکن بھی ہے کہ یہ اُس کے خلافِ مرضی کاموں کا ارتکاب کرتا رہے۔

حالانکہ خالق کی عظمت وُہ ہے کہ دُنیا کی کوئی بڑی سے بڑی چیز اُس کے سامنے آ نہیں سکتی۔ اور وُہ حاضر و ناظر بھی اس طرح ہے کہ کسی وقت بندہ اُس کی نگاہ سے اوجھل نہیں ہوتا۔ خدا کو یاد دلانے کا مقصد یہی ہے کہ انسان جب اُسے یاد رکھے گا تو ایسے ہی کام کریگا جو اُس کی مرضی کے موافق ہوں۔ اس سے مقصودِ خلقِ خدا کی عملی اصلاح ہے۔ اور یہ مقصد اسی صورت سے پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے کہ انسان خالق کی عظمت اور اُس کے حاضر و ناظر ہونے کا خیال اپنے دل میں قائم رکھے۔ اسی لیے قرآن مجید نے ان دونوں باتوں پر زور دیا ہے ایک طرف خداوند عالم کے اُن اوصاف کا امکانی الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے جو اُس کی عظمت کا احساس پیدا کر سکیں اور امکانی طاقتوں کی اُس کے سامنے بے بسی دکھلائی ہے۔ اس کے لئے بہت سے طریقے اختیار کیے گئے ہیں۔

کبھی اسمائے جلال و کمال کے تابڑ توڑ تذکرہ سے دماغ پر اُس کی عظمت کا اثر ڈالا مثلاً اَلْمَلِكِ الْقُدُّوسِ الْعَزِيزِ الْمُهَيْمِنِ الْجَبَّارِ الْمُتَكَبِّرِ الْخَالِقِ الْبَارِئِ الْمُصَوِّرِ۔ کبھی افعال میں اُس کے استقلال اور انفراد کا تذکرہ کر کے اُسے توجہات انسانی کی مرکزیت کا مستحق ثابت کیا مثلاً مَا لَهُ مِنْ شَرِيكٍ اُس کا

...وئی شریک نہیں"۔ مَالَہٗ مِنۡ ظَهِيرٍ۔ اُس کے لیے کوئی پُشت
...پناہ یعنی مددگار کی ضرورت نہیں۔ کبھی زمین اور آسمان کی تمام
...بعتوں پر اُس کا قبضہ دکھلا کر اُس کے اقتدار کا پتہ دیا لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
...الْاَرْضِ "خدا ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے"
...کبھی عزت اور ذلت پر اُس کا اختیار ظاہر کر کے گردنوں کو اُس کے
...سامنے خم کیا۔ تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ۔ "تو اے خدا جسے
چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے"۔
کبھی اُن کی بے نیازی اور تمام خلائق کی اُس کے سامنے نیازمندی
کا اظہار کیا ان الفاظ میں کہ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ وَاَنۡتُمُ الْفُقَرَآءُ۔ "خدا ہے بس
جو بے نیاز ہے اور تم سب اُس کے محتاج ہو"۔ کبھی انسان کی بے بسی
کی تصویر کھینچ دی ان لفظوں میں کہ وَاِنۡ يَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ شَيۡئًا لَّا
يَسۡتَنۡقِذُوۡهُ مِنۡهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطۡلُوۡبُ۔ "اگر خدا کا ایک
کمزور مخلوق جس کا نام مگس ہے ان سے کچھ چھین کر لے جاتا ہے
تو اُس کے ہاتھ سے چھڑا نہیں سکتے۔ دونوں کمزور۔ یہ جو پیچھا کریں
اور وہ جس کا پیچھا کرنا چاہیں"۔
دنیا میں سلطنت سے بڑھ کر کوئی شے باعظمت نہیں سمجھی جاتی
مگر دُنیاوی سلاطین کے غرور اقتدار کو ٹھوکر لگا دی یہ کہہ کر کہ تَبَارَكَ
الَّذِيۡ بِيَدِهِ الْمُلۡكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيۡءٍ قَدِيۡرٌ۔ "بابرکت ہے
وہ ذات جس کے ہاتھ میں ہے سلطنت اور جو ہر بات پر قادر ہے"۔

آخری فقرہ سے ان سلاطین کی بے بسی کی طرف ایک لطیف اشارہ ہے مطلب یہ ہے کہ جنہیں تم بادشاہ سمجھتے ہو یہ تو اپنی ذات اور اُس کے بدلتے ہوئے حالات پر قدرت نہیں رکھتے چہ جائے کہ دُنیا کی تمام کائنات۔ باعظمت تو وُہ ہستی ہو سکتی ہے جس کا اقتدار وسیع ہو اور ہر شے جس کے احاطۂ قدرت میں ہے۔ پھر بھی اگر مجازکے پردے آنکھوں پر پڑے رہیں تو اُس وقت کی تصویر کھینچی جبکہ عدم کا پردہ عالم کے جاہ و جبروت کو نظروں سے اوجھل کر چکا ہوگا، جبکہ فنا کا سمندر ہر طرف موجیں مار رہا ہوگا اور ایک آواز لا محدود فضا میں گونجتی ہوگی کہ لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ بتاؤ آج سلطنت کس کی ہے"۔ اور ایک عالم گیر خاموشی جواب دیتی ہوگی لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَہَّارِ۔

کیا یہ مرقعے اگر انسان کو یاد رہیں تو ممکن بھی ہے کہ وُہ خدا کی عظمت کے مقابلہ میں کوئی دوسرا خیال ذہن میں لا سکے؟

یہ سب ایک طرف اور دوسری طرف قرآن مجید نے حضرت ربّ العزت کے علم واطلاع اور حالاتِ خلق سے باخبر ہونے کو طرح طرح سے انسان کے ذہن نشین کیا ہے۔ کبھی تو عمومی طور پر ارشاد کیا اِنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ۔ "خدا ہر بات کا جاننے والا ہے"۔ اور کبھی خصوصی طور پر بندوں کو مخاطب کر کے اُن کے اعمال سے اُس کی واقفیت کا اظہار کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ۔ یقیناً جو کچھ تم کرتے ہو اُس سے

را آگاہ ہے"۔ اور بعض مقامات پر اسی آگاہی کو لفظ بدل کر زیادہ پُرزور بنا
ہے کہ اِنَّ اللّٰہَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ "یقیناً خدا جو کچھ تم کرتے ہو
سے دیکھتا رہتا ہے۔ چونکہ انسانی حدودِ تصور میں دیکھنے سے زیادہ کوئی
ریعہ علم کا مکمل نہیں۔ اس لیے یہ لفظ صرف کر دی گئی ہے۔ ورنہ حقیقت
کے لحاظ سے خدا کا بصیر ہونا بھی کمالِ علم ہی ہے اور کوئی دوسری چیز
ہیں ہے۔ ایک جگہ انسان کی ذہنیت کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس سے اُس کی
مدا فراموشی کا ثبوت ملتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ
وَلَا یَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰہِ وَھُوَ مَعَھُمْ اِذْ یُبَیِّتُوْنَ مَا لَا یَرْضٰی
مِنَ الْقَوْلِ وَکَانَ اللّٰہُ بِمَا یَعْمَلُوْنَ مُحِیْطًا۔

یہ آدمیوں سے تو چھپتے پھرتے ہیں اور خدا سے نہیں چھپتے حالانکہ وہ
اُن کے ساتھ ہے جبکہ یہ راتوں کو ایسی گفتگوئیں کرتے ہیں جن سے خدا راضی
نہیں ہے۔ اور خدا اُن کے اعمال پر پورا پورا حاضر رکھتا ہے۔

کتنا لائقِ ماتم ہے انسانی ذہنیت کا یہ نقشہ کہ وہ جرائم کے ارتکاب
کے وقت حتی الامکان نگاہِ خلق سے پنہاں ہونا پسند کرتا ہے اور اس کی
کوشش کرتا ہے، مگر اُسے کوئی پرواہ نہیں ہوتی اِس بات کی کہ اُس کا
خالق اُس کا مالک، اُس کا حاکم اور حقیقی شہنشاہ جس کا یہ گناہ کر رہا ہے وہ
خود اُسے دیکھ رہا ہے۔

یہ بڑے اطمینان کے ساتھ ارتکابِ جُرم کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے
کہ کسی کو اطلاع نہیں ہوئی۔ اب یا خدا کو کچھ سمجھتا ہی نہیں یا خدا کو عام

مخلوق کی طرح بے خبر جانتا ہے؛ یا اگر وہ اپنے دل کے کسی گوشہ میں اُلُہدا کا
اعتقاد مضمر رکھتا بھی ہے تو اُسے بھولا ہوا ہے۔ اسی لیے بار بار یاد دہانی
کی ضرورت ہے اور اسی لیے ارشاد ہوا ہے "فَاذْكُرُونِي" مجھے
یاد رکھو۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے کام نہ کرو جو میرے بھولنے کا نتیجہ
ہو سکتے ہیں۔ بلکہ فرائض کا خیال رکھو۔ اس صورت میں نتیجہ کیا ہوگا
یہ کہ اَذْكُرْكُمْ "میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا"۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ کیا معاذ اللہ
خدا کسی کو بھولتا بھی ہے؟ نہیں نہیں بھولتا تو نہیں۔ یہ صفت نقص ہے اور
خدا کی ذات اس سے بلند و بالاتر ہے۔ مگر بھولا وے میں ڈالتا ضرور ہے
یعنی رحمت کی نگاہ نہیں کرتا اُن بندوں پر جو ہمہ تن گناہوں میں غرق ہو جائیں
لیکن اگر بندہ اپنے خدا کو یاد رکھے تو پھر خداوند عالم کی جانب سے وعدہ ہو
رہا ہے کہ میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ دنیا و آخرت دونوں کی بہتری اسی ایک
مژدہ میں مضمر ہے۔ اسی لیے خدا کی یاد بہترین عبادت بلکہ اصل اصولِ
عبادت قرار پائی ہے۔ لیکن دُنیا میں بعض بندے بھی ایسے ہیں جن کی یاد
خدا کی یاد کی طرح عبادت بن جائے۔ ملاحظہ ہو رسالت مآب صلے اللہ
علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد۔ ذِكْرُ عَلِيٍّ عِبَادَةٌ۔ یعنی علی بن ابی طالبؑ کا ذکر
عبادت ہے۔ یہ بظاہر سمجھ میں نہیں آتا کیونکہ عبادت وہ ہے جو خالق
سے تعلق رکھتی ہو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ایک بندہ خالق سے متحد ہرگز
نہیں ہے۔ پھر اُس کی یاد خدا کی عبادت کیسے ہو سکتی ہے۔ مگر غور کیجئے
تو معلوم ہوگا کہ علیؑ ایک ایسا بندہ ہیں جن کے اوصاف کے تذکرہ سے

خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے اس لئے اُن کا ذکر عین ذکرِ خدا ہے
دوسری بات یہ ہے کہ علیؑ کی سیرت اور اُن کے حالات کے
سُننے سے بندگیِ خدا کا ذوق و شوق پیدا ہوتا ہے اس لیے وُہ
عبادت ہے۔ تیسرے یہ کہ انہوں نے دُنیا کے سامنے اپنے
عمل سے شریعتِ الٰہی اور تعلیمِ مذہب کی صحیح تصویریں پیش کر دی
ہیں۔ اس لئے جس طرح قرآن مجید کی تلاوت و تفسیر اور معانی کی معرفت
عبادت ہے۔ کیونکہ وُہ شریعتِ الٰہی کے لفظی تعلیمات کا مجموعہ ہے،
اسی طرح علی بن ابی طالبؑ کے حالات کا بیان کرنا اور سُننا عبادت ہے
اس لیے کہ وُہ شریعت کے ان ہی تعلیمات کا عملی مجسمہ ہیں۔ بلکہ قرآن
تو کتاب صامت ہے۔ اُس میں ہدایت کا دم نہیں اگر اہلبیت معصومینؑ
اُس کی تشریح کر کے دُنیا کے سامنے پیش نہ کر دیں۔

اسی سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ مصائبِ سید الشہداؑ
کے تذکرہ کو، مجلس کرنے کو، ذکرِ امام حسینؑ سُننے کو عبادت کیوں بتایا
گیا ہے۔ بات یہی ہے کہ حسینؑ نے اپنی ہستی مقصدِ الٰہی کے لیے فنا
کر دی اس لیے ان کی یاد نے بقا کی شکل اختیار کر لی۔ اب ان کی یاد ایک
شخصِ انسانی کی یاد نہیں ہے جو فنا کی مستحق ہو بلکہ وُہ خدائے باقی سرمدی
کی یاد ہے جو جاوداں رہنے کی حق دار ہے۔ دیکھئے تو دُنیا نے اس کے
مٹانے کی کتنی کوشش کی۔ مگر دُنیا مِٹ گئی اور یہ یاد اُسی طرح قائم ہے
اس لیے کہ اس کی بقاء سے مقصدِ الٰہی کی بقا ہے۔ حقیقۃً فضائل امیر المومنینؑ

ہوں یا مصائب شہیدِ کربلا، دونوں کے تذکرہ کا بہت بڑا مقصد یہی ہے کہ ناواقف لوگ ان حضرات کے اوصاف و کمالات سے روشناس ہوں اور ان کے تعلیمات اور اُسوۂ حسنہ کو دیکھ کر اپنے عمل کا جائزہ لیں ہمارا محفوظ کرنا، یا ہماری طبیعتوں کو رنج و غم کا خوگر بنانا ہرگز کوئی ایسا بلند مقصد نہیں ہے جس کے لئے اتنی کوشش اور تاکید کی جائے۔

یہ سمجھنا کہ ائمہ معصومین جو کر گئے وُہ اُن کی ذات سے مخصوص تھا۔ ہم اُس کی پیروی نہیں کر سکتے، بالکل غلط ہے۔ کیونکہ پیروی کر لینا دوسری چیز ہے، اور پیروی کی کوشش کرتے رہنا دوسری چیز ہے۔ ہمارا فرض یہی دُوسرا ہے۔ ہمارا نصب العین ہونا چاہیے اُن کی مکمل پیروی پھر ہمارے ظرف و امکان میں جتنی وسعت ہے اُتنا ہم اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے۔ یہی چیز ہے وُہ جسے امیر المومنینؑ نے اپنی سیرت کا تذکرہ کر کے ان الفاظ میں ادا فرمایا ہے:۔

"اَلَا وَاِنَّكُمْ لَا تَقْدِرُوْنَ عَلٰى ذٰلِكَ وَلٰكِنْ اَعِيْنُوْنِىْ بِجُهْدٍ وَقُوَّةٍ۔" معلوم ہونا چاہیے کہ تم لوگ اس پر قادر نہیں ہو گے مگر اپنے مقدور بھر میرا ساتھ تو دو۔"

اگر ایسا نہ ہوتا تو رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کو جو تمام معصومینؑ میں بلند درجہ رکھتے ہیں قرآن مجید میں بطورِ نمونہ پیش نہ کیا جاتا، اور اُس کے اتباع کی دعوت نہ دی جاتی۔ آپ کے سامنے واقعۂ کربلا کی مثال پیش کی جاتی ہے۔ وہاں تو سب معصوم افراد بھی نہ تھے۔ امام حسینؑ کی

ایک ذات تھی جو یقینی طور پر عصمت پوش ہے۔ اچھا بنی ہاشم کو بھی کہہ دیجئے کہ وہ عصمت کی آغوش کے پروردہ تھے۔ مگر اصحاب پر نظر ڈالئے وہ تو صرف شیعہ اور محبِ اہلبیت تھے مگر انہوں نے عمل کا کیسا نمونہ پیش کیا۔

یقین سمجھئے کہ رسولؐ کے ساتھ ایک ہی ذات تھی علیؑ بن ابی طالب کی جنہوں نے شبِ ہجرت رسولؐ کی حفاظت کے لئے اپنے تئیں دشمنوں کی کھنچی ہوئی تلواروں کے درمیان رکھ دیا۔ اس جاں نثاری پہ آیت مدح گزرتی ہوئی اتری :۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۔ "دُنیا میں ایسے بھی آدمی ہیں جو بیچ ڈالتے ہیں اپنی جان کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے"۔ مگر حسینؑ کے ساتھ کربلا میں ایسے لوگ تھے جن میں سے ہر شخص نے اپنی جان کو نصرتِ حضرت سیدالشہداء میں فروخت کر ڈالا تھا۔

شانِ نزول بے شک مخصوص ہے ذات امیرالمومنینؑ سے۔ مگر میرا اعتقاد ہے اور یقیناً حقیقت کے مطابق ہے کہ اصحاب حسینؑ بھی اس آیت کے مصداق میں داخل ہیں۔

اُنہوں نے جس استقلال، جس ثباتِ قدم اور پُر جگری کے ساتھ اپنی قلت کا لحاظ نہ کرتے ہوئے دشمن کی فوج کے سیلاب کا مقابلہ کیا ہے اُس کی نظیر نہ اُن کے پہلے نظر آئی نہ اُن کے بعد۔ اُن میں سے ہر شخص حسینؑ کے وجود کے سامنے اپنی ہستی کو فنا سمجھتا تھا۔ وہ زندگی اسی

کو سمجھتے تھے کہ حسینؑ کے قدموں پر جان نثار کر دیں۔

عاشور کی صبح ہے اور امامؑ ایک خیمہ کے اندر ہیں اور دروازہ پر عبدالرحمٰن بن عبد رب انصاری اور بُرَیر ہمدانی دونوں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بُرَیر عبدالرحمٰن سے کوئی مذاق کی بات کرتے ہیں۔ وُہ بگڑ کر کہتے ہیں۔ "بُرَیر مذاق کا دن نہیں ہے"۔ اب سُنیے بُرَیر کا جواب۔ اُنہوں نے کہا: "عبدالرحمٰن! میری قوم والے جانتے ہیں کہ مجھے مذاق کی عادت نہیں۔ مگر آج سے بڑھ کر تو خوشی کا کوئی دِن ہو ہی نہیں سکتا کہ ہم فرزند رسولؐ کی نصرت میں عنقریب اپنی جانیں نثار کریں گے اور حیاتِ جاودانی حاصل کریں گے۔

آپ ذرا اپنی طبیعت کا جائزہ لیجئے۔ کیا ایسے سخت وقت پر یہ جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے۔ ہم اگر محبتِ اہلبیت کا دعوٰے رکھتے ہیں تو ہمیں یہ دل و جگر پیدا کرنا چاہیے۔ ورنہ ہم لاکھ زبان سے کہتے رہیں یَا لَیْتَنَا کُنَّا مَعَکُمْ فَنَفُوْزَ فَوْزًا عَظِیْمًا "کاش اے اصحابِ حسینؑ ہم بھی آپ کے ساتھ ہوتے اور یہ بڑی کامیابی حاصل کرتے۔"

مگر ہمارا عمل ہمارے قول کی تصدیق نہیں کر سکتا۔

لیجئے وُہ وقت آگیا کہ صفوفِ لشکر مرتب ہو گئے۔

عمر سعد نے اپنی فوج میں میمنہ و میسرہ، قلب و جناح کی ترتیب دی اور علم لشکر اپنے غلام درید کو دیا۔

اور حسینؑ نے اپنے ساتھیوں کو۔ کیا کہوں۔ اتنے کم آدمیوں کو اگر لشکر کہا جا سکے۔ خیر حسینؑ نے بھی اپنے اس مختصر لشکر کو مرتب کیا۔ میمنہ پر زہیر بن قین، میسرہ پر حبیب ابن مظاہر۔ علمِ لشکر اپنے بھائی قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباس کے ہاتھوں میں دیا۔ امامؑ نے دشمن کے سامنے اتمامِ حجت کے لیے خطبہ بھی پڑھ لیا مگر کوئی اثر نہ ہُوا۔

• عمر سعد نے درید کو آواز دی کہ علمِ لشکر میرے پاس لا۔ درید بڑھا اور عمر سعد نے ایک تیر چلّہ کمان میں جوڑ کر لگایا اور کہا اے اہلِ لشکر گواہ رہنا کہ پہلا تیر فوجِ حسینؑ کی طرف میں نے لگایا ہے۔

یہ سُننا تھا کہ ہزاروں تیر روانہ ہو گئے۔ مگر کیا اصحابِ حسینؑ پر ہراس طاری ہوا؟ لا واللہ۔ امامؑ نے فرمایا بہادرو اُٹھو یہ دشمن کے سفیر تمہاری طرف جنگ کا پیغام لے کر آ گئے۔ اصحاب کمر ہمت مضبوط باندھ کر تیار ہو گئے اور جہاد کے لیے کھڑے ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک ایک ایک سپاہی میدان میں آتا رہا اور دست بدست جنگ ہوتی رہی۔ دشمن کی فوج کے سپاہی قتل ہوتے رہے۔ مگر ایک دفعہ عمر سعد کی فوج نے قریب آ کر یکبارگی تیروں کا حملہ کر دیا۔ اس موقع کا تصوّر ذرا دشوار ہے۔ کم و بیش ۷۰ آدمیوں کی مختصر صف اور اُس کے سامنے ہزاروں کا بڑا لشکر اور اُس ایک نشانہ پر ہزاروں تیروں کا رُخ۔ سمجھ لیجئے کہ لوہے کا سیلاب تھا جو ہر طرف سے چھا رہا تھا۔ مگر کیا کہنا اصحابِ سیّد الشہداؑ کی شجاعت کا۔ انھوں نے تلواریں

سوت لیں اور تیروں کے اس طوفان کو اپنے سینوں سے ریلتے ہوئے
آگے بڑھ گئے اور فوجِ دشمن میں گھس کر شمشیر زنی کرنے لگے۔ آخر
میں دشمن کو شکست دے کر پسپا کیا۔ مگر افسوس کہ اس حملہ میں پچاس
ناصر حسینؑ مظلوم کے کام آ گئے۔ پھر بھی کیا اُن میں کوئی حسینؑ کا عزیز
یا آپ کا بچّہ تھا؟ لا واللہ۔ یہ تو اصحاب کی باوفائی کا ایک حیرت انگیز
معجزہ سمجھئے کہ جب تک اُن میں سے ایک بھی باقی رہا حسینؑ کے کسی عزیز
کو ایک زخم تک لگنے نہیں پایا۔ ہاں جب اُن میں سے کوئی نہ رہا تو
پھر علیؑ و فاطمہؑ کے دل کے ٹکڑے تھے اور تیروں کی سنانیں تلواروں
کی باڑھیں تھیں۔ اور ایک حربہ تھا جو زیادہ تر بچّوں کے کام آیا۔ وہ تیر ستم
تھے۔ یہی تیر کا ظلم تھا جس نے رباب کی گود خالی کی، اور اسی نے عبداللہ
بن حسنؑ کا کام تمام کیا۔

رہ گئے خود ہمارے آقا حسینؑ۔ انہوں نے سب حربوں کا حق
ادا کر دیا۔ نیزوں اور تلواروں کے زخموں کی تعداد کسے معلوم ہے۔ مگر
آخر وقت صالح بن وہب کا نیزہ اور ابحر بن کعب کی تلوار یاد رہے گی
تیروں کا کیا تذکرہ۔ روایت میں یہاں تک ہے کہ صَارَ جِلْدُہٗ
کَالْقُنْفُذِ۔ آپ کے جسم مبارک پر اتنے تیر لگے تھے کہ جیسے ساہی
کے بدن پر کانٹے ہوتے ہیں۔" یہ سب حربے تو تھے ہی مگر حسینؑ کے لیے
کچھ حربوں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ارے جب سب ہتھیاروں سے حوصلہ
نکال لیا گیا تو پیشانی مبارک کو پتھر سے مجروح کیا گیا۔ پیشانی سے خون

جاری ہُوا۔ یہ ظلم تو وُہ تھا کہ زندگی تک محدُود نہیں رہا۔ کیا آپ بھول گئے کوفہ کا بازار۔ ایک برآمدہ اور سرِ حسینؑ پر ایک سنگدل عورت کا ظلم یعنی غضب تو یہ تھا کہ زینبؑ دیکھ رہی تھیں۔ آپ نے اپنا سر چوبِ محمل پر دے مارا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ حربوں کے وار ختم ہو گئے ؟ نہیں نہیں ابھی باقی ہے۔ دربارِ یزیدؔ اور چوب خیزران، لب و دندانِ حسینؑ۔ ہائے حسینؑ۔ وائے حسینؑ۔!

مجلس چہارم

محرّم کی چوتھی تاریخ ۸ھ

قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ:۔ قُلْ لَّآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی۔

رسُولؐ سے خطاب ہے کہ ”کہہ دو میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا سوائے اس کے کہ میرے قرابتداروں کے ساتھ محبّت رکھو۔“

یہ ایک اعلان ہے جو رسُولؐ کی زبان سے کرایا جا رہا ہے ان لوگوں کے لئے جو رسُولؐ کے خدمات کی کچھ قدر و قیمت سمجھتے تھے۔

وُہ رسُولؐ جس نے خدمتِ خلق میں اپنی زندگی کو بے آرام بنا دیا۔

جس نے طرح طرح کی مشقتیں جھیلیں اور تکلیفیں سہیں۔ جس کا قول تھا
مَا اُوْذِیَ نَبِیٌّ قَطُّ کَمَا اُوْذِیْتُ "کسی نبی کو یہ ایذائیں نہیں دی
گئیں جتنی ایذائیں مجھے دی گئیں"۔

جس کے جسم پر پتھر لگائے جاتے تھے یہاں تک کہ خون جاری
ہو جاتا تھا۔ جس کے سر پر خس و خاشاک ڈالا جاتا تھا۔ جس کو کئی برس
تک ایک درۂ کوہ میں محصور بنایا گیا تھا اور قسمیں کھائی گئی تھیں کہ ان تک
آب و غذا تک نہ پہنچنے دیا جائے جن کے قتل پر سب متفق ہو گئے تھے
یہاں تک آپ کو وطن چھوڑ دینا پڑا تھا۔

جس نے دین حق کی اشاعت کے لیے اپنے عزیزوں کو قربان
کر دیا۔ جس نے اُحد میں اتنے زخم کھائے کہ جسم خون میں تر ہو گیا اور
دندان مبارک کو صدمہ پہنچا۔

اُس رسُول ؐ کی خدمتیں کیا ایسی ہیں کہ دُنیا کی کوئی دولت اُن کا معاوضہ
بن سکے۔ لاواللہ۔

رسالت مآب ؐ کو اگر دولت کی فکر ہوتی تو عرب کے مشرک پہلے ہی
کہتے تھے کہ آپ جتنی کہیں اُتنی دولت دے دی جائے کہئیے تو آپ کو
اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں۔ جس بڑے سے بڑے خاندان میں کہئیے آپ کی
شادی ہو جائے مگر آپ اس کلمۂ توحید کا اعلان ترک فرما دیں۔ مگر رسُول ؐ
نے فرمایا کہ یہ سب کیا ہے اگر میرے ایک ہاتھ پر آفتاب رکھ دیا جائے،
اور ایک ہاتھ پر ماہتاب تو بھی میں اس پیغام کا پہنچانا ترک نہ کروں گا۔

انہوں نے اپنے مقصد کی تکمیل کو ہر دنیوی منفعت پر مقدم سمجھا۔
ن کو جب خدیجہ کبریٰ رضؓ کی دولت ہاتھ آئی تب بھی اُسے اپنے لیے محفوظ
نہیں کیا بلکہ اسلامی مفاد کے لئے اُسے صرف کر دیا اور خود فاقے کئے۔
یٹ پر پتھر باندھا مگر دولت مند بننے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ تو
رماتے رہتے تھے اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ "فقیر رہنا میرے لیئے ناز کا سرمایہ ہے"۔
پھر اُنہیں دولت کی کیا فکر ہو سکتی تھی۔

معلوم ہوتا ہے اغنیائے زمانہ کا دامن کسی ایسے سرمایہ سے خالی
تھا جو رسولؐ کے خدمات کا عوض بن سکے۔ پھر بھی شاید مسلمانوں کا دل
چاہتا تھا کہ رسولؐ کے خدمات کا کچھ معاوضہ پیش کیا جائے اور ممکن ہے
جیسا کہ آیت شان نزول کے بعض روایات سے پتہ چلتا ہے یہ بات
کچھ لوگوں کی زبان سے نکلی ہو کہ ہم رسولؐ کی خدمت میں اُن کی قیمتی خدمات
کا کچھ معاوضہ حاضر کریں۔

جواب صاف تھا کہ معاوضہ کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ تبلیغ و ہدایت تو
رسولؐ کا فرضِ منصبی تھا اور اس سلسلہ میں مالی معاوضہ تو بہت پست چیز ہے
جسے عام انسانوں کے لیے قابلِ تعریف نہیں سمجھا جا سکتا، چہ جائیکہ رسولؐ۔
یہ لوگ تو وہ تھے جو اگر کسی کے ساتھ تبرعاً کچھ نیک سلوک کریں، تو
اُس کا بدلا شکریہ اور تعریف کی صورت میں بھی نہ چاہتے تھے۔ کیا
آپ کے پیشِ نظر نہیں ہے ہَلْ اَتٰی کی آیت۔ اہلبیت رسولؐ کا
مقولہ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا "ہم اس عطیہ کے مقابلہ

میں تم سے نہ کوئی بدلا چاہتے ہیں نہ کسی طرح کا شکریہ"۔ پھر بھلا رسول اپنے خدمات کا معاوضہ کیا چاہتے۔

پھر جبکہ دُوسرے پیغمبروں کی آواز قرآن میں یہ موجود ہے وَمَا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ مِنْ اَجْرٍ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ "میں تم سے کچھ معاوضہ نہیں چاہتا۔ میرا معاوضہ تو بس خداوند عالم سے متعلق ہے"

اسی کو متعدد الفاظ میں کئی جگہ دوہرایا گیا ہے۔ پھر جب پیغمبروں کی سیرت یہ رہی کہ وُہ کبھی اُمّت سے اجر کے طالب نہ ہوں تو ہمارے پیغمبرؐ جو سابقہ انبیاء سے بلندیٔ نفس اور عزت میں زیادہ تھے اُن کی شان کب اس کی متقاضی ہو سکتی ہے کہ وُہ اُمّت سے کوئی اجر طلب کریں غیر ممکن ہے۔ ماننا پڑے گا کہ جو چیز بطور اجر رسولؐ نے طلب کی۔ وُہ آپ کی ذات کے لیے کسی فائدہ کا سبب نہیں ہے بلکہ وُہ خود اُمت کے فائدہ کی بات ہے۔ یُوں سمجھئے کہ یہ اجر رسالت کا تقاضا بلکہ خود رسالت ہی کے فرائض کا ایک جزو ہے۔ اور اگر ایسا نہ ہوتا تو خداوند عالم خود بطور حکم اُسے آپ پر لازم نہ قرار دیتا۔

اُجرت کا تعلق تو اُس انسان کے حق امتیازی سے ہوتا ہے جو کسی کام کا انجام دینے والا ہے۔ وُہ اگر چاہے تو اپنا اجر نہ مانگے نہ لے۔ یہ ایک ایثار ہوگا جو قابلِ تعریف سمجھا جائے گا۔ خداوند عالم کو کیا ضرورت کہ وُہ مامور کرے کہ تم اجر اپنا مانگو یا لو ضرور۔ مگر آیت میں حکم موجود ہے خدا کا کہ "اے رسولؐ تم کہو میں تم سے کوئی

اجر نہیں چاہتا سوائے اس امر کے کہ تم میرے اہلبیتؑ سے محبت رکھو"
معلوم ہوتا ہے کہ یہ اجر وُہ ہے جس کے ادا کرنے پر اُمت تو پابند
بعد کو ہوگی لیکن اُس کے طلب کرنے کے لیے رسُولؐ سب سے پہلے
پابند بنائے گئے۔ وُہ مامور ہوئے کہ کہیں اور اُمت سے مانگیں۔ اب
بھی کاش اُمت کی آنکھیں کھلیں اور وُہ سمجھے کہ یہ اجرِ رسالت کا حقیقۃً
ہماری ہدایت کا ایک سامان ہے۔ ورنہ خداوندِ حکیم کی طرف سے اُس
کا حکم نہ ہوتا۔

رسُولؐ کے اہلبیتؑ اگر عام انسانوں کے ایسے ہوتے تو کوئی وجہ
نہ تھی کہ اُن کی محبت مسلمانوں کے لیے فرضِ عین قرار دی جائے۔ اطاعت
کا رشتہ حضرتِ احدیت کی نگاہ میں قرابت سے زیادہ طاقتور ہے۔
اس لیے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا کہ سب سے زیادہ حقدار ابراہیمؑ کے
وُہ لوگ ہیں جنہوں نے اُن کی پیروی کی اطاعت نہ ہونے سے فرزند تک
کو اہل سے خارج کر دیا گیا۔ جب نوحؑ نے لڑکے کو غرق ہوتے دیکھا اور
بارگاہِ الٰہی میں عرض کی "پالنے والے! یہ میرا بیٹا میرے اہل میں سے ہے
اور تیرا وعدہ سچا ہے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے"۔ ارشاد ہوا:۔
اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ "اے نوحؑ یہ تمہارے
اہل سے نہیں ہے یہ تو بداعمال شخص ہے"۔ پھر جب معمولی درجہ کے
انبیاء ذاتی قرابت کے سامنے اطاعت اور عمل کے ترجیح دینے پر
مامور تھے تو دُنیا کا آخری پیغامبرؐ جو تکمیلِ انسانیت کے لیے بھیجا گیا

تھا اُسے کیسے مامور کیا جاسکتا تھا کہ وُہ اپنی ذاتی قرابت کی وجہ سے تمام لوگوں کی گردنیں اپنے عزیزوں کے سامنے جھکا دے۔

یقیناً آپ جو اپنے قرابتداروں کی محبّت کی تبلیغ پر مامور ہوئے تو وُہ صرف قرابت کی بناء پر ہرگز نہ تھا بلکہ رسُولؐ کے قرابتدار عملی حیثیت سے کچھ ایسے درجۂ کمال پر فائز تھے کہ اُن کی طرف نگاہوں کا موڑنا مقصدِ خالق کی تکمیل کا باعث تھا۔

محبّت میں ایک جذب اور کشش ہے۔ آپ جب کسی کو دوست رکھیں گے تو اُس کی طرف نسبت رکھنے والی ہر چیز آپ کو عزیز معلوم ہوگی۔ اُس کے خط و خال، شکل و شمائل کے ساتھ ساتھ اُس کے اوصاف و اعمال بھی دل میں جگہ پا جائیں گے۔ پیغمبرؐ نے اپنے اہلبیتؑ کو ایک مرقع بنایا تھا جمالِ اوصاف اور کمالِ انسانیت کا۔ اور اس لیے ضرورت تھی کہ مسلمانوں کے دل میں اُن کے ساتھ تعلّق پیدا کیا جائے تاکہ اس تعلق کی بنا پر وُہ ان کے ذات و صفات اور حالات کا مطالعہ کریں اور اُن کمالاتِ انسانی سے رُوشناس ہوں جو اُن کی ذات میں مضمر ہیں۔

اسی لیے خدا نے رسُولؐ کو مامور کیا کہ وُہ اپنی رسالت کا اجر اُمّت سے مانگیں اور وُہ اجر یہی ہو کہ اُمّت آپ کے اہلبیتؑ سے محبّت رکھے۔

یہ اجر حقیقۃً رسُولؐ کے فائدہ کی بات نہ تھی بلکہ اس سے مسلمانوں ہی کے لیے فلاح اور نجات کا سامان کرنا تھا۔ اس کے لیے رسولؐ کو سائل بنایا گیا اور خود پیغمبرؐ نے طرح طرح سے اس محبّت کا اعلان کیا اور انتہائی شدّت

کے ساتھ اس کی طرف دعوت دی۔ کبھی ان کی محبت کو علامت ایمان قرار دیا اور ارشاد فرمایا:۔ یَا عَلِیُّ حُبُّكَ اِیْمَانٌ وَ بُغْضُكَ كُفْرٌ وَنِفَاقٌ "اے علی تمہاری محبت ایمان اور تم سے دشمنی کفر و نفاق ہے۔" کبھی خود اپنی محبت کا تذکرہ کیا اور خدا سے اُن کی محبت رکھنے والے کے لیے دُعا کی۔ جیسے شاہزادے کے بارے میں ارشاد کیا:۔ "حُسَیْنٌ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنَ الْحُسَیْنِ اَحَبَّ اللّٰهُ مَنْ اَحَبَّ حُسَیْنًا وَ اَبْغَضَ اللّٰهُ مَنْ اَبْغَضَ حُسَیْنًا۔" "حسینؑ مجھ سے ہے اور میں حسینؑ سے ہوں دوست رکھے خدا اُس کو جو میرے فرزند حسینؑ کو دوست رکھے اور دشمن رکھے خدا اُس کو جو میرے فرزند حسینؑ کو دشمن رکھے"۔

کبھی اُن کی محبت کے فوائد بتلائے اور آخرت کی نجات کو اس کے ساتھ وابستہ قرار دیا اس طرح کہ ارشاد کیا "صراط سے نہ گزرے گا مگر وُہ جس کے پاس محبتِ اہل بیتؑ کا پروانہ ہو۔ کبھی اس محبت کو گناہوں کے فنا ہو جانے کا سبب قرار دیا:۔ حُبُّ عَلِیٍّ یَاكُلُ الذُّنُوْبَ كَمَا تَاكُلُ النَّارُ الْحَطَبَ۔ محبت علیؑ بن ابی طالبؑ کی گناہوں کو اس طرح کھاتی ہے جس طرح آگ خشک لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

اس کے یہ معنی سمجھنا بالکل غلط ہے کہ محبت امیر المؤمنینؑ کے ساتھ انسان ہزاروں گناہ کرتا رہے کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ تو اصُولِ فطرت کے خلاف چیز ہے۔ محبت ایک جذب پیدا کرتی ہے جس کا ایک آخری درجہ اتحاد کی منزل بتلایا گیا ہے کم سے کم ایک کشش پیدا

ہونا ان اوصاف کیطرف ضروری ہے جو محبوب کی ذات میں نظر آتے ہیں۔ اور علیؑ کی ذات وُہ ہے جو اطاعتِ خدا کا مجسّمہ تھی۔ پھر کہاں ممکن ہے کہ علیؑ کے سچے محبّ کو گناہوں کی طرف رغبت پیدا ہو۔

رسُولؐ نے گناہوں سے پاک ہونے کا ایک ذریعہ بتلایا ہے وُہ گویا ایک اکسیر ہے جس سے ناقص نفوس کامل بنتے ہیں، پست اخلاق بلند ہوتے ہیں اور گناہگار انسان نیکوکار ہو جاتے ہیں۔

علی بن ابی طالبؑ کی محبت گناہوں کو نیست و نابود کر دیتی ہے اُسی طرح جیسے آگ خشک لکڑی کو جلا کر خاک کر دیتی ہے اس لیے کہ علی ابن ابی طالب علیہ السّلام کے ساتھ محبت یہ احساس پیدا کر دیتی ہے کہ کونسی باتیں اُن کو پسند ہیں اور کونسی ناپسند۔ محبّت انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وُہ کوشش کرے ان باتوں کے انجام دینے کی جنہیں اُس کا محبُوب پسند کرتا ہے اور ایسے کاموں سے علیحدہ رہنے کی جن سے محبُوب کو صدمہ پہنچتا ہو اور وُہ اُس کی مرضی کے خلاف ہوں۔

محبّت کی آزمائش فرمائشوں کی تعمیل سے ہوتی ہے۔ آپ کسی کی رفاقت کا دم بھرتے ہوں اور وُہ کبھی آپ سے کوئی فرمائش کر دے تو آپ امکان بھر اس فرمائش کو پورا ضرور کریں گے۔ اگر اس میں کوتاہی ہوئی تو آپ کا دعوائے محبت مشکوک ہو جائے گا اور اگر تابڑ توڑ چند دفعہ ایسا ہی ہوتا رہا تو پھر آپ کی محبت کا دعوائے

بالکل غلط سمجھا جائے گا۔

یہی طریقہ خداوند عالم کا اپنے دم بھرنے والوں کے ساتھ رہا ہے کہ جتنا محبت کا دعوےٰ زیادہ تھا اُتنا سخت حکم کی تعمیل کا بار ڈال دیا گیا۔ سلسلۂ انبیاء میں حضرت ابراہیمؑ خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ وُہ خلیلِ خدا تھے۔ خلت کے معنی خاص دوستی کے ہیں۔ ابراہیمؑ کی محبت اپنے پروردگار کے ساتھ اس درجہ پر تھی کہ اُس کا نام سُننے کے اشتیاق میں اپنا تمام مال و دولت نذر کرنے کو تیار ہو گئے تھے مگر قدرت کی جانب سے اُن کا امتحان ہوا اور بڑا سخت امتحان۔

اپنے ہاتھ سے اپنے فرزند کو ذبح کرنا معمولی بات نہیں ہے ابراہیمؑ نے عمل کی منزل میں ثابت قدم رہ کر اپنے دعوائے محبت کی تصدیق کر دی۔ خود قرآن مجید میں محبت الٰہی کی صحت کا معیار اطاعت اور اتباع کو قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ۔ "اے رسولؐ کہہ دو کہ اگر تم اللہ کی محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تمہیں دوست رکھے گا"۔ اضافی رشتوں کی عزت منسوب الیہ کے اعتبار سے بدل جاتی ہے۔ عالم تصور و خیال میں محبّت کے لیے اس سے بلند کوئی نقطہ نہیں کہ اُس کا تعلق واجب الوجود خالق کائنات اور ربّ العالمین کے ساتھ ہو۔ اس سے بڑھ کر معزز کوئی محبت کا رشتہ نہیں ہو سکتا۔ مگر اس محبت کے دعوے کو ٹھکرا دیا جاتا ہے اُس وقت جبکہ اطاعت و اتباع اس کی تصدیق کے

لیے موجود نہ ہو۔

حضرت علی بن ابی طالبؑ نے اپنی زندگی صرف کر دی خدا کی راہ میں بلکہ اپنی جان کو رضائے الٰہی کے لیئے فروخت کر ڈالا۔ پھر علی بن ابی طالبؑ کی محبت کیا یہ احساس پیدا نہیں کرے گی کہ ہم اُن کے پسند کے موافق کام انجام دیں۔ ہر گز امیر المومنینؑ اُس سے خوش نہیں ہو سکتے جو خدا کے احکام کی پرواہ نہ کرتا ہو نہ یہ شخص آپ کی محبت کا صحیح دعوے دار ہے۔

سچی محبت کے ساتھ یہ احساس پیدا ہونا ضروری ہے کہ ہم کوئی بات ایسی نہ کریں کہ جو حضرت علی بن ابی طالبؑ کے منشار کے خلاف ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہم گناہوں کا ارتکاب نہ کریں؛ اور اگر کچھ گناہ پہلے ہو گئے ہوں تو اُن پر پشیمان ہوں کہ ایسا کیوں ہوا۔ اس پشیمانی کا لازمی نتیجہ ہے یہ مصمم ارادہ کہ آئندہ ایسا نہ کریں گے۔ یاد رہے کہ گزشتہ افعال پر پشیمانی اور آئندہ کے لیے اس طرح کا عہد اور ارادہ اسی کا نام توبہ ہے جس کے بعد کوئی گناہ انسان کے نامۂ عمل میں باقی نہیں رہتا۔ یہ تھی محبت جس نے گناہوں کو فنا کر دیا۔

ملاحظہ فرمائیے اُن افراد کی سیرت کو جو محبتِ علی بن ابی طالب میں کمال کے نقطہ پر فائز تھے۔ دیکھئے کہ ان کو اپنے فرائض اور احکام خداوندی کی اطاعت کا کتنا خیال تھا۔ سلمان فارسیؓ، ابو ذر غفاریؓ، مقداد، عمار یاسرؓ ان میں سے ہر ایک فرد زہد و تقوائے عبادت و ریاضت میں اپنا مثل نہ رکھتی

تھی۔ یہ تھے محبِّ اہلبیتؑ اور شیعۂ علیؑ جن کے تشیع کے آثار اور محبّت کے نقوش چہروں کے خط و خال سے آشکار تھے۔

خود امیر المومنینؑ کے زمانہ میں تھے دعوے دار محبّت کے جو دوستی کے اعلان ہی کو اپنا آخری نصب العین سمجھتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ امیر المومنینؑ کے سامنے آئے اور کہا کہ ہم آپ کے شیعہ ہیں۔ حضرتؑ نے فرمایا مَالِی لَا اَریٰ عَلَیکُم سِیمَاءَ الشِّیعَۃِ "کیا بات ہے کہ میں تمہارا شیعوں کا سا حُلیہ نہیں پاتا"۔ پُوچھا گیا وَمَا سِیمَاءَ الشِّیعَۃ۔ "کیا ہیں شیعوں کے آثار؟" آپؑ نے فرمایا: لب ذکرِ الٰہی میں خشک، چہرہ روزے رکھنے سے زرد، آنکھیں خوفِ خدا میں رونے سے رمد آلود۔ یہ ہیں میرے شیعوں کے اوصاف و خصوصیات۔

ہم شیعیت کا کمال یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ مطمئن ہو جائیں کہ بخشش ہماری ضرور ہو گی۔ مگر شیعیانِ علیؑ وہ تھے جو خوفِ الٰہی سے کانپتے رہتے تھے۔ امام حسنؑ کے اصحاب میں سفیان ابن ابی لیلےٰ، حجر بن عدی وغیرہ سب ہی ایسے لوگ تھے جو عابد و زاہد اطاعت گذار اور شب زندہ دار تھے، اور اُن کی ذات پر اطاعت و عبادت ناز کرتی تھی۔ مگر اس کی تکمیل امام حسینؑ کے اصحاب نے کی جو کربلا میں تھے۔

ان کے پہلے میں ہر دور میں چند ہی فرد یں پاتا ہوں جو تاریخ

میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن اگر مجھ سے اصحاب حسینؑ کی فہرست پوچھیئے تو میں ایک ساتھ بہتّر یا اُس سے زیادہ نام پیش کر دونگا جنہوں نے ایسے سخت موقع پر عبادتِ خدا اور اطاعتِ امامؑ کا مظاہرہ کیا ہے جس کی نظیر دستیاب نہیں ہو سکتی۔

محبت کا دعویٰ رکھنے والے ہمیشہ رہے مگر سخت موقع پر اپنے فرض کا احساس رکھنا بڑا دشوار مرحلہ ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ پیغمبرؐ کے ساتھ والے سب ہی رسولؐ سے محبت کا دعوےٰ نہ رکھتے تھے۔ مگر بگڑی ہوئی جنگ کے کٹھن موقع پر اُحد اور حنین میں دل کی حالت کا اظہار کر دیا اور محبت کا پردہ چاک ہو گیا۔

امام رضاؑ سے ابوسہل خراسانی نے جب دوستوں کی کثرت کا حال بیان کیا تو امامؑ نے تنور میں آگ روشن کرا دی ابوسہل سے فرمایا اس تنور میں داخل ہو جاؤ۔ انہوں نے عذر کیا اور معافی مانگی۔ حضرتؑ نے سکوت اختیار فرمایا۔ تھوڑی دیر میں ہارون مکی آتے ہوئے نظر آئے۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ ذرا اس آگ میں داخل تو ہو جاؤ۔ ہارون نے ماجرا تک دریافت نہ کیا۔ فوراً تنور کی طرف بڑھے اور آگ میں پھاند پڑے۔ امامؑ نے فرمایا دوست ہمارے ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہمارے حکم کی تعمیل میں عذر نہیں ہوتا۔

مَیں سچ کہتا ہوں کہ اس آگ کی کوئی حقیقت نہ تھی اُس آتشِ مَوت کے سامنے جو کربلا میں روشن تھی۔ وہاں ایک ہی شخص نکلا،

جو حکمِ امامؑ کی اطاعت کرے۔ مگر کربلا میں پورا مجمع ہمہ تن آمادہ تھا اور ایک دوسرے پر سبقت کر رہا تھا۔

پھر دوسرا فرق ہے کہ وہاں امامؑ نے حکم دیا تھا کہ آگ میں داخل ہو اور یہاں مظلومِ کربلا اپنی بیعت گردنوں سے اٹھا رہے تھے۔

شبِ عاشور آپ نے تمام اصحاب کو جمع کیا۔ حمد و ثنائے الٰہی کے بعد ارشاد فرمایا "مجھے نہیں معلوم کوئی اصحاب جو میرے اصحاب سے زیادہ باوفا ہوں اور نہ کوئی عزیز جو میرے عزیزوں سے زیادہ حق شناس ہوں۔ مگر یہ سخت موقع ہے۔ فیصلہ کا دن آگیا ہے۔ ان لوگوں کو میری جان سے مطلب ہے۔ اور اگر یہ مجھے قتل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو کسی دوسرے سے انہیں غرض نہیں۔ یہ رات تاریک چھائی ہوئی ہے اس پردۂ شب میں تم لوگ چلے جاؤ۔ میرے حقوق کا کوئی خیال نہ کرو۔ میں اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے اٹھائے لیتا ہوں۔

اس کے بعد حضرتؑ نے عجیب حسرت کا کلمہ فرمایا۔ ارشاد کیا تمہارے جانے سے میرا بھی یہ فائدہ ہے کہ میرے عزیزوں میں سے ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کے تم اپنے ساتھ لیتے جانا تاکہ ان کی جان بچ جائے اور یہ صورتیں دنیا سے فنا نہ ہوں۔

حسینؑ کے اس خطبہ نے اصحاب میں بے چینی پیدا کر دی سب سے پہلے عزیز پکار اٹھے کہ بھلا ہم اور آپ کا ساتھ چھوڑ کر جائیں؟ خدا ہمیں آپ کے بعد زندہ نہ رکھے۔ اس کے بعد اصحاب کی باری

آئی۔ سن رسیدہ، کمر خمیدہ، مجاہد، مسلم بن عوسجہ کھڑے ہوئے۔ کہنے لگے فرزندِ رسولؐ! بھلا ہم آپ کا ساتھ چھوڑ کر جائیں گے؟ خدا کی قسم! میں ان سے نیزہ سے جنگ کروں گا یہاں تک کہ میرا نیزہ ان کے سینوں میں ٹوٹ جائے، اور تلوار لگاؤں گا جب تک کہ اُس کا قبضہ میرے ہاتھ میں ٹھہر سکے۔ اور میں آپ سے کسی طرح جُدا نہ ہوں گا۔ اگر ہتھیار نہ ہوں گے کہ جن سے جنگ کروں تو میں انہیں پتھر ماروں گا اور آپ کی حمایت کروں گا یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر اس جان کو نثار کر دوں۔ زہیر بن قین نے کہا کہ خدا کی قسم اگر مجھے قتل کیا جائے پھر میری لاش کو جلایا جائے، پھر میری خاک کو ہوا میں منتشر کیا جائے تب بھی میں آپ کا ساتھ نہ چھوڑوں گا۔

آنے والے دن نے بتلا دیا کہ جو کچھ ان بہادروں نے کہا تھا وہ سچ تھا۔ اُن کی وفاداری کا بڑا کارنامہ تھا یہ کہ جب تک اُن میں سے ایک بھی زندہ رہا بنی ہاشم میں سے کسی فرد کو ذرا سی خراش تک نہیں آئی۔ مگر جب یہ بہادر موت کی نیند سو گئے تو علیؑ و فاطمہؑ کے دِل کے ٹکڑے تھے اور دشمنوں کی تلواریں۔

جعفر و عقیل کی اولاد قتل ہوئی۔ حسنؑ مجتبیٰ کے یتیم تلواروں سے ٹکڑے ہوئے۔ عباسؑ و علی اکبرؑ دُنیا سے رُخصت ہو گئے اور انتہا ہے کہ چھ مہینہ کی جان علی اصغرؑ تک نشانۂ تیرِ ستم ہو گئے۔ کون تھا جو اب بچاتا۔ آخر میں فرزندِ رسولؐ میدان میں اکیلے تھے اور تیر و نیزہ و

شمشیر کے حملے ہو رہے تھے۔ وُہ جسم رسُولؐ کی آغوش میں پلا، سینہ پر رہا، دوش پر چڑھا، فاطمہؑ نے جس کو ناز و نعمت سے پالا وُہ ٹکڑے ٹکڑے کیا جا رہا تھا۔

یہ وُہ مصیبت ہے جسے حجت خدا نے زیارت ناحیہ میں یاد کیا ہے "اَلسَّلَامُ عَلَی الْاَعْضَاءِ الْمُقَطَّعَاتِ" سلام ہو اُن اعضائے جسم پر جو ٹکڑے کیے گئے"۔ افسوس فرزند رسولؐ کا جسم زمین کربلا پر رہا اور سر جُدا ہو کر کہاں کہاں لے جایا گیا۔

کاش اسی پر اکتفاء کی جاتی۔ نہیں نہیں بلکہ سر مطہر کے ساتھ طرح طرح کی بے ادبیاں بھی کی گئیں۔ اس پر قیامت یہ تھی کہ چاہنے والی بہن آنکھوں سے دیکھتی تھی وُہ منظر جس پر زید بن ارقم کو تاب نہ رہی اور کہا تھا کہ اے ابن زیاد ہٹا لے اپنی چھڑی کو اس لب و دندان سے۔ میں نے خود رسولؐ کو دیکھا کہ وُہ اس مُنہ کے بوسے لیتے تھے۔

کیا گزری ہوگی اُس وقت زینبؑ کے دل پر مگر کیا کرتیں؟ حمایت کرنے والے تو کربلا کے جنگل میں موت کی نیند سو چکے تھے ایک بیمار باقی تھا وُہ اس عالم میں تھا کہ ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں، گلے میں طوق خار دار پہنے تھا۔ پھر زینبؑ کی فریاد کو کون سُن سکتا تھا۔

مجلس پنجم

محرّم کی پانچویں تاریخ

قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

یہ آیت ہے اُس سلسلہ کی جس میں حضرتِ اقدس الٰہی نے دو جماعتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ ایک وُہ جو دُنیا کو سب کچھ سمجھتی ہے۔ ارشاد ہُوا ہے کہ "کچھ وُہ لوگ ہیں جن کا قول یہ ہے کہ خداوند عالم ہم کو جو کچھ دینا ہو دُنیا ہی میں دے دے۔ اُن کا انجام یہ بتایا گیا ہے کہ آخرت میں اُن کا کوئی حصہ نہ ہو گا۔ یہ خدا کی نظر میں وُہ جماعت ہے جو مذمّت اور اُخروی ہلاکت کی مستحق ہے۔ اس کے مقابلہ میں سطحی نگاہ سے دیکھنے میں وُہ جماعت آتی ہے جس کا مقولہ یہ ہو کہ خداوندا جو کچھ ہمیں دے، وُہ آخرت میں دے دے۔ مگر قرآن نے اس گروہ کو بالکل نظر انداز کر دیا اور کوئی تعریف اس کی نہیں کی۔ بلکہ قرآن نے پہلی جماعت کے مقابل ایک وسطی معتدل جماعت کا تذکرہ کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ :-

"کچھ اور وُہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ پروردگارا ہم کو دنیا میں ایک نیکی عطا کر اور آخرت میں ایک نیکی اور ہم کو آتشِ دوزخ

کی سزا سے محفوظ رکھ۔

اس جماعت کا انجام یہ بتایا گیا ہے کہ انہیں اپنے نیک اعمال کے بدلے میں حصہ دیا جائے گا۔ معلوم ہُوا کہ کامیابی اور نجات اس گروہ کے لیے ہے جو اعتدال کے نقطہ پر ہے اور نہ دُنیا کو برباد کرتا ہے اور نہ آخرت کو نظر انداز۔

یہی اسلام کا خاص امتیاز ہے کہ وُہ ہر شعبۂ زندگی میں درمیانی راستہ کی طرف دعوت دیتا ہے۔ نہ افراط کو پسند کرتا ہے اور نہ تفریط کو۔ اس نے اعتدال کو کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اس دنیا و آخرت کے معاملہ میں بھی اس کا یہی رویّہ ہے۔ ایک طرف ملاحظہ ہو اربابِ دُنیا کا طرزِ عمل۔ یہ اپنی ذات کے وقتی فائدہ کو ہر بات میں پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ کسی مظلوم کا گلا کٹ جائے۔ کوئی کمزور ان کے ہاتھوں پامال ہو جائے۔ کسی کا گھر ان کے ہاتھوں برباد ہو جائے؛ انہیں نہیں مطلب۔ اپنا پیٹ بھرے، اپنی نمود ہو، اپنی شان و شوکت کا مظاہرہ ہو بس یہی اُن کا آخری نصب العین ہے۔

اُنہیں احساسِ فرائض کا خیال بھولے سے بھی یاد نہیں آتا۔ اُن کو آخرت کی یاد دلائی بھی جائے تو وُہ اُسے ہنسی میں اُڑا دیں گے اور کبھی متاثر نہ ہوں گے۔ یاد رکھئے کہ آخرت کو بھول جانا ہر طرح کی بداخلاقی اور شرمناک جرائم کا سرچشمہ ہے اور ہونا بھی چاہیئے اس لیے کہ انسان اپنے نفس سے زیادہ کسی کو عزیز نہیں رکھتا۔ اس

کی دوسروں کے ساتھ محبّت بھی اپنے لیے ہوتی ہے۔ باپ بھائی اولاد سب کو انسان اپنی ذات کے لیے چاہتا ہے۔ پھر اگر انسان کی ذات سے کسی دُوسرے کے مفاد کو تصادم ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ وُہ اپنے فائدہ کو دُوسرے کی خاطر نظر انداز کردے جبکہ نہ اُس فائدہ کے حصول میں اُس کو اندیشہ فردا ہے، نہ اُس فائدہ کے چھوڑنے میں کسی آیندہ کی بہتری کا تصوّر۔ اس صُورت میں تو بیشک عقل کا بھی فیصلہ یہی ہے کہ وُہ زائد سے زائد اپنے نفس کو فائدہ پہنچاتا رہے، اور اپنے کو جہاں تک ممکن ہو نقصان سے محفوظ رکھے دُوسرے کے لیے اُس میں بھلائی ہو یا بُرائی۔

مگر یاد رکھنا چاہئے کہ اس صورت میں دُنیا کبھی چین نہیں پا سکتی۔ اور عالم میں ہمیشہ تموج، اضطراب، کشمکش اور باہمی تصادم باقی رہے گا۔ اس کے مقابل میں ایک ایسی جماعت کا خیال ذہن میں آتا ہے جو دنیاوی راحت و آرام اور سامانِ زندگی کو نظر اُٹھا کر دیکھتے ہی نہ۔ اور تمام دُنیا سے الگ تھلگ ہو کر ایک گوشۂ تنہائی میں لق و دق صحرا میں خدا کی نماز اور یاد میں عمر بسر کر دے۔ اس طرح کے لوگ عیسائی جماعت میں موجود تھے اور وُہ عزّت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

یہ لوگ شادی کرنا، روپیہ حاصل کرنا، کچھ سامانِ زندگی فراہم کرنا، اس سب کو خدا کی بندگی کے خلاف سمجھتے تھے۔ آج بھی انجیل

میں یہ لکھا ہوا نظر آتا ہے کہ "خداوندی سلطنت میں وہ شخص داخل نہیں ہو سکتا جو شادی کر لے۔ وہ ملکوتِ الٰہی میں داخل نہیں ہو سکتا جو ایک وقت کھائے اور دوسرے وقت کے لیے اُٹھا کر رکھے"۔ اگرچہ عیسائی جماعت عام طور سے اس پر عمل نہیں کر سکی۔ اور عمل کرتی تو کیسے جبکہ وہ نظامِ اجتماعی کے بالکل خلاف ہے۔ انسانی آبادی قبر میں پہنچ جائے اگر ایک چوتھائی صدی تک بھی سب اس تعلیم پر عمل کریں۔

پھر ایک ایسا قانون دُنیا میں کہاں چل سکتا ہے جو انسانی آبادی کے ختم کرنے کا ذریعہ ہو اور جس سے یہ دُنیا بجائے آباد ہونے کے بالکل برباد ہو جائے۔ اسی لیے اسلام نے اس راستہ کی کوئی تائید نہیں کی بلکہ صاف اعلان کر دیا:۔ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ۔ تعلقاتِ دنیوی کا ترک کرنا اسلام میں کوئی چیز نہیں ہے"۔ خود رسولِ اسلام نے بھی اس پر عمل نہیں کیا اور نہ اُن کے خاص تعلیم پر مکمل طور سے عمل کرنے والوں نے اس کی کبھی مثال پیش کی۔

یہاں تو یہ تعلیم ہے کہ اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ۔ "دُنیا آخرت کی کھیتی ہے"۔ یہ اُسی درمیانی نصب العین کے اظہار کی ایک صورت ہے۔

یعنی ایسا نہ ہو کہ دُنیا ہی کو اپنا آخری نقطۂ نگاہ سمجھ لو۔ یہ تو اُس وقت ہوتا جب اس زندگی کا حاصل اسی زندگی سے متعلق ہوتا

پھر تو اس آرائش، رنگینی اور مسرت و راحت کی فکر رہنا چاہیئے تھی۔ کیونکہ آغاز بھی یہیں ہے اور انجام بھی یہیں ہے۔ مگر تم کو اپنی نگاہ اس سے دُور رکھنا چاہیئے۔ تم کو یقین رکھنا چاہیئے کہ یہ دُنیا کھیتی ہے جس کا حاصل ایک دُوسری زندگی سے متعلق ہے۔

کھیت میں انسان کو آرائش کی اتنی فکر نہیں رہتی جتنی پیداوار کے بڑھانے اور عُمدہ بنانے کی فکر ہوتی ہے۔ یہاں محنت مشقت اور جدّ وجہد کرتا ہے، دھوپ کی گرمی برداشت کرتا ہے، سر کا پسینہ پاؤں تک بہاتا ہے صرف آیندہ کی توقع میں۔ بس اسی صورت سے دُنیا دار العمل ہے۔ یہاں تمہارا کام ہے کہ فرائضِ حیات کو پُورا کیے جاؤ۔ جدّ وجہد اور کوشش کرتے رہو تاکہ تمہاری آیندہ کی زندگی خوشگوار ہو۔ کھیت کی تشبیہ میں ایک اور راز مضمر ہے۔ وُہ ایمان بالغیب کی حقیقت ہے جو زراعت کے لیے نہایت ضروری ہے۔

مشاہدہ پرست اور جلد باز انسان کو سبق لینا چاہیئے اس مثال سے کہ آج دانہ زمین میں بویا گیا تو وقتی حیثیت سے وُہ ضائع ہوگیا، مٹی میں مل گیا، لیکن آپ کی آنکھوں سے اوجھل ہونے کے بعد سطح زمین کے پردہ کے نیچے وُہ نہ صرف باقی رہتا ہے بلکہ بڑھتا رہتا ہے اور مستقبل میں وُہ شاداب زراعت کی شکل میں آپ کی نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ نتیجہ ہے صبر و تحمل اور

عاقبت اندیشی کا۔ یُوں ہی آپ کی دُنیا کے اعمال آج محنت اور مشقّت کا باعث ہوتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے برباد ہو گئے۔ مگر وُہ برباد نہیں ہوتے بلکہ باقی رہتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہُوا ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنُ عَمَلاً

"خدا ضائع و برباد نہیں کرے گا اجر کو اُن لوگوں کے جنہوں نے اچھے اعمال کئے۔"

بلکہ اُن میں اضافہ بھی ہوتا ہے:۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِىْ كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ۔

"مثال اُن لوگوں کی جو اپنے اموال کو صرف کرتے ہیں راہِ خدا میں اُس دانہ کی سی ہے جس سے سات بالیاں اُگیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔"

اسی پر انتہا نہیں بلکہ ارشاد کیا وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ۔ "خدا جس کے لیے چاہتا ہے اور اضافہ کر دیتا ہے۔"

جس طرح زمین کے لحاظ سے زراعت میں پیداوار بڑھتی ہے اُسی طرح وقت اور ماحول اور درجۂ اخلاص کے لحاظ سے عمل کی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔

جس طرح بغیر کچھ بوئے ہوئے حاصل کی اُمید رکھنا غلط ہے اُسی طرح دُنیا میں بے کار رہ کر آخرت کے فائدہ کی اُمید کرنا خیال خام ہے۔ دنیا کی زندگی اُس آخری منزل کا پیش خیمہ ہے۔ اور ہمیں یہ زندگی اس طرح گزارنا چاہیے کہ ہماری کشتِ اُمید آخرت میں لہلہاتی ہوئی نظر آئے۔

خالق نے انسان کی خلقت اپنی عبادت کے لیے کی ہے۔ مگر عبادت کے معنی سمجھنے میں اکثر لوگ غلطی کرتے ہیں۔ وُہ سمجھتے ہیں کہ عبادت کے معنی ہیں فقط نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ۔ اب ناممکن ہے کہ تمام انسان ہر وقت انہی کاموں میں لگے رہیں اور اگر نہ لگے رہیں تو اُن کی زندگی کے وُہ حصّے جو دُوسرے کاموں میں صرف ہوں مقصد خلقت کے لحاظ سے بے کار قرار پائیں گے۔ مگر عبادت کے معنی اتنے محدُود نہیں ہیں۔

عبادت خالق کی بندگی کا مظاہرہ ہے اور اس لیے تمام فرائض جو خالق کی طرف سے انسان پر عائد ہیں وُہ عبادت سمجھے جائیں گے۔ اور انسانی فرائض نماز و روزہ میں منحصر نہیں ہیں۔ یہ باتیں بھی انفرادی طور پر ہر ایک کی اصلاحِ نفس کے لیے ضروری قرار دی گئی ہیں۔ مگر اس کے علاوہ تمدّنی اور اجتماعی فرائض نوعِ انسانی کے باہمی حقوق، انصاف، امانت اور دیانتداری خدمتِ خلق اور بہت سی باتیں ہیں جن سے اخلاقِ انسانی میں کمال پیدا

ہوتا ہے اور نوعِ انسانی کے لیے بہترین نتائج حاصل ہوتے ہیں۔

اسی تکمیلِ اخلاق کے لیے رسُولِ آخرالزمان کی بعثت ہوئی۔ آپ نے فرمایا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ "میں مبعوث ہوا ہوں اس لیے کہ بزرگ اخلاق کی تکمیل کروں"۔ آپ نے زندگی کے وُہ اصُول بتلائے جن سے دُنیا بھی آباد ہو اور آخرت بھی۔

معصومؑ کا ارشاد ہے لَیْسَ مِنَّا مَنْ تَرَکَ الدُّنْیَا لِلْاٰخِرَتِہٖ وَلَا مَنْ تَرَکَ الْاٰخِرَۃَ لِلدُّنْیَا۔ ہم سے کوئی تعلق نہیں اُس کو جو دُنیا کو آخرت کے لیے ترک کر دے اور نہ اُس کو جو آخرت کو دُنیا کی خاطر چھوڑ دے"۔

دُنیاوی زندگی کی بہبودی کے لیے صنعت و حرفت، تجارت و زراعت سب ہی راستے دکھلائے اور اُن پر چلنے کی تاکید کی۔ یہ آج ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اُن تمام ذرائع کو چھوڑ بیٹھے ہیں اور بے کاری کی زندگی گذارتے ہیں جس کا نتیجہ تباہی اور ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

حالانکہ آئمۂ معصومینؑ نے تجارت پر ترغیب دینے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور خود اُس پر عمل کر کے ہمارے لیے مثالیں قائم کیں۔ خود جناب رسالتمآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ میں نبوّت کے پہلے تجارت نظر آئے گی۔ آپ حضرت خدیجہؓ کے اموال لے کر اجیر کی صورت سے شام تشریف لے گئے اور اُن کو فروخت

کر کے منافع حاصل فرمایا۔

اگر تجارت کسی طرح بھی عزت کے گھٹانے کا باعث ہوتی یا اخلاقِ انسانی کے خلاف ہوتی تو ناممکن تھا کہ خدا اُسے نبوت کا سرنامہ قرار دے۔ پھر ہمارے آقا امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ۔ آپ نے زندگی گزاری محنت مشقت اور مزدوری میں۔ یہودیوں کے باغ میں آب کشی کرتے تھے اور اُس سے اپنے گھر والوں کے آب و طعام کا سامان کرتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ آپ نے اپنے زورِ بازو اور ذاتی مشقت سے بہت سے غلام خریدے اور راہِ خدا میں آزاد کیے۔ اس کے بعد اُس وقت جب آپ کو خلافت ظاہری ہوئی اور کوفہ کے دارالسلطنت میں آپ بحیثیت شہنشاہِ اسلام تشریف فرما تھے تب بھی میثم تمار کی دوکان پر بیٹھ کر خرمے فروخت کرنا اپنی شان کے خلاف نہ سمجھے۔

امام جعفر صادقؑ اس شان سے نظر آتے ہیں کہ آپ اپنے ہاتھ سے دیوار اُٹھا رہے ہیں۔ جب دُوسروں نے عرض کی کہ آپ ہٹ جائیے ہم یہ کام انجام دے دیں تو آپ نے فرمایا نہیں میں چاہتا ہوں کہ اپنا رزق اپنی ذاتی محنت سے حاصل کروں۔

اس کے علاوہ اور بھی مثالیں ہیں اُن کے دیکھنے کے بعد ہماری کیا مجال ہے کہ ہم تجارت، محنت یا مزدوی کو نگاہِ حقارت سے دیکھ سکیں۔

یہ تجارت یعنی خرید و فروخت تو اتنی مستحسن چیز ہے کہ خداوند عالم نے خاص اعزاز کے موقع پر ان الفاظ کو صرف کیا ہے۔ ملاحظہ ہو میدانِ جنگ میں مجاہدینِ راہِ خدا کا کھنچی ہوئی تلواروں اور نیزوں کے سامنے سر بکف جانا اور منزلِ شہادت کی طرف قدم بڑھانا۔ کتنی بلند منزل ہے۔ مگر اس کے لیے قدرت کی طرف سے جو لفظ صرف ہوتی ہے وُہ خرید و فروخت کی۔ یہ اور بات ہے کہ اس بازار کا خریدار وُہ خود ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ۔ "خدا نے خریدا ہے مومنین" سے اُن کی جان اور مال کو اس معاوضہ میں کہ اُن کے لیے جنّت ہے"۔

دیکھئے تو کتنا گرانبہا سودا ہے جو تلواروں کی چھاؤں میں ہو رہا ہے۔ کہاں یہ نفوس و اموال جو خود ایک نہ ایک دن فنا ہونے والے ہیں اور کہاں وُہ سرائے باقی اور عالمِ جاودانی۔ ہمیشہ بہار باغ جہاں خزاں کا گزر نہیں۔ اور پژمردگی کا نشان نہیں۔ مجاہدینِ راہِ خدا اس جان و مال کو راہِ خدا میں پیش کر کے اُس نعمتِ لازوال کے مالک بن جاتے ہیں۔ جنت اس وقت ان کی مِلک ہو جاتی ہے"۔

مگر یاد رکھئے کہ پھر بھی جنت پر مکمّل قبضہ کسی کا بھی نہیں ہے یعنی ہر ایک خود وہاں کی نعمتوں سے مالامال ہوگا مگر کسی کو یہ اختیار

نہیں کہ جسے چاہے جنّت میں داخل کرے اور جسے چاہے جنّت سے علیحدہ رکھے۔ یہ درجہ اگر ہے تو محمدؐ و آلِ محمدؐ کو۔

یہ ان معنوں سے مالکِ جنّت بھی ہیں اور مالکِ نار بھی کہ جسے چاہے بہشت میں رکھیں اور جسے چاہے جہنّم میں بھیج دیں مگر یاد رکھیے کہ چاہتے یہ وہی ہیں جو خدا چاہے۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ۔ یہ خود کچھ چاہتے ہی نہیں جب تک کہ خداوندِ عالم نہ چاہے۔

بات یہ ہے کہ جب انہوں نے اپنے نفس کو بازارِ تجارت میں پیش کیا اور خداوند عالم خریدار بنا تو جنّت اُن کے نفس کی بلندی کے سامنے پست نظر آئی۔ کیونکہ یہ لوگ خود جنّت کو کوئی وقیع چیز نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا:-

مَا عَبَدْتُكَ طَمَعًا فِیْ جَنَّتِكَ وَلَا خَوْفًا مِنْ نَارِكَ وَلٰكِنِّیْ وَجَدْتُكَ اَهْلًا لِلْعِبَادَةِ فَعَبَدْتُكَ۔

"نہ مَیں نے تیری عبادت کی ہے تیری جنّت کی لالچ میں، اور نہ تیری خلق کی ہوئی آگ کے خوف سے۔ بلکہ مَیں نے تجھ کو عبادت کا مستحق پایا اس لیے تیری عبادت کی"۔

پھر جب یہ اتنے بلند نگاہ تھے تو ان کے نفس کے مقابلہ میں جنّت کیا چیز تھی۔ اس لیے جب علیؑ نے شبِ ہجرت اپنے نفس کو سرکارِ خداوندی میں پیش کیا تو جنّت سے بلند چیز اس کی

قیمت میں دی گئی، اور وہ رضائے الٰہی ہے۔ ارشاد ہوا:۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ۔

"دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے نفس کو فروخت کرتے ہیں رضائے الٰہی کے حاصل کرنے کے لیے"۔

یہاں ایک طرف ہے بندہ کا نفس اور دوسری طرف ہے خالق کی رضامندی۔ تولے جاتے ہیں اور دونوں پلے برابر رہتے ہیں اور خالق اس نفس کو اتنا بلند سمجھتا ہے کہ اپنی رضامندی کو اس کی قیمت قرار دے دیتا ہے۔ یاد رکھیے کہ جنّت اور اس کی تمام نعمتیں رضائے الٰہی کا ایک پرتو ہیں۔ جب خدا کی مرضی ان کی ہو گئی تو جنّت اور نار سب ان کے ہاتھوں میں ہے۔

مگر یہ نہ سمجھئے کہ رضائے الٰہی کوئی جنس ہے جو ان کے قبضہ میں آگئی تو خدا ان کا پابند ہو گیا۔ خدا کی رضا پر قابض ہو جانے کے معنی صرف اتنے ہیں کہ ان کا ہر عمل خدا کو پسندیدہ ہے اور وہ اس وقت کہ جب یہ بے نفس ہو گئے ان کا نفس اب اپنا رہا نہیں تاکہ اس میں مرضیِ الٰہی کے خلاف خواہشیں پیدا ہو سکیں۔ اب محبت ہے تو خدا کی راہ میں، عداوت ہے تو خدا کے بارے میں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ حقیقی بھائی تک اگر اپنے حق سے زیادہ بیت المال سے طلب کرتے ہیں تو ان کی عزیزداری کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ وہ بگڑتے ہیں اور جا کر امیر شام سے ملحق

ہو جاتے ہیں۔ مگر علیؑ اس کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔ تختِ حکومت پر بیٹھنے کے بعد مشیر کار کہتے ہیں کہ معاویہ کو تختِ شام سے ابھی معزول نہ کیجئے۔ ابھی دلجوئی کر دیجئے پھر جب کامل تسلّط ہو جائے معزول کر دیجئے گا۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں ایک ایسے شخص کو اپنی طرف سے حاکم مقرر کر کے ایک دن کی بھی اُس کے افعال کی ذمہ داری نہیں کر سکتا۔ معزول کر دیتے ہیں۔ اور اس کے نتیجہ میں وہ تمام مصائب اُٹھاتے ہیں جو امیرِ شام کے ہاتھوں آپ کو اُٹھانا پڑے۔ انتہا یہ کہ بقول مُلّا جامی عمرو بن عبدوُد ایسا دُشمن آپ کے ساتھ بے ادبی کرتا ہے یعنی چہرۂ مبارک پر لعاب دہن پھینکتا ہے جب آپ بارادۂ قتل شمشیر بکف اُس کے سینہ پر ہیں۔ مگر آپ اس لیے اپنا ہاتھ روک لیتے ہیں اور علیحدہ ہو جاتے ہیں کہ ذاتی جذبہ شریک نہ ہو جائے چاہتے ہیں کہ ہاتھ کی ہر جنبش صرف خدا کی مرضی کے لیے ہو۔ اس خلوصِ عمل سے ایک ضربت میں اتنا وزن پیدا ہو گیا کہ وہ جن و انس سب کی عبادت سے زیادہ ہو گئی اور جناب رسالتمآبؐ نے ارشاد فرمایا

ضَرْبَةُ عَلِيٍّ يَوْمَ الْخَنْدَقِ أَفْضَلُ مِنْ عِبَادَةِ الثَّقَلَيْنِ۔

”علیؑ کی ایک ضربت خندق کے دِن والی جن و انس سب کی عبادت سے بہتر ہے۔“

یہ بے نفسی کا نتیجہ ہے کہ حالتِ نماز میں تیر جسم مبارک سے نکال لیا جائے اور خبر نہ ہو۔

آیت شانِ نزول کے اعتبار سے اگرچہ امیرؑ المومنین کے متعلق ہے، مگر کوئی شبہ نہیں کہ امام حسینؑ نے بھی اپنی جان راہِ خدا میں بیچ ڈالی تھی۔ بلکہ مجھے کہنے دیجئے کہ علی بن ابی طالبؑ کا نفس آپ کے جسم میں بیچ ڈالنے کے بعد بھی ظاہر میں باقی رہا۔ لیکن کربلا میں حسینؑ نے اپنے نفس کو جو راہِ خدا میں دینے کا تہیّہ کیا تھا اُس کی پُوری تکمیل ہوئی۔ انہوں نے جو بیعنامہ اپنی جان کا خدا کے ہاتھ کیا اُس پر اپنے خون کی مُہر لگا کر ہمیشہ کے واسطے ثبوت قائم کر دیا۔

حسینؑ نے تنہا اپنا نفس خدا کے ہاتھ نہیں فروخت کیا بلکہ وُہ بازارِ شہادت میں بڑے ساز و سامان سے آئے تھے۔ انہوں نے ایسے ایسے گوہرِ بے بہا اور جواہر پارے اپنے ساتھ لیے تھے، جن کا مثل و نظیر عالم میں نہ تھا۔ اصحاب و انصار میں وُہ عابد و زاہد اور شب زندہ دار لوگ جن کے زہد و تقویٰ، عبادت و ریاضت کا ملکِ عرب میں شہرہ تھا۔ مسلم بن عوسجہ، حبیب بن مظاہر، بریرہ ہمدانی، ابو ثمامہ۔ خدائے پاک کے وُہ مقدس بندے تھے جن کی ذات اسلام و ایمان کے لیے ناز کا سرمایہ تھی۔

امامؑ نے سب سے پہلے اصحاب و انصار کے نفوس کا تحفہ پیش کیا۔ یہ کتنے گراں قیمت نفوس تھے بس اس سے اندازہ کر لیجئے کہ امامِ عصرؑ نے اُن سے خطاب کر کے ارشاد فرمایا:-

بِأَبِي أَنْتُمْ وَأُمِّي طِبْتُمْ وَطَابَتِ الْأَرْضُ الَّتِي فِيهَا دُفِنْتُمْ وَ فُزْتُمْ فَوْزًا عَظِيمًا۔

"میرے ماں باپ تم پر فدا ہوں تم پاک ہوئے اور پاک ہوئی وہ سرزمین جس میں تم دفن ہوئے اور کامیاب ہوئے تم جو کامیابی کا حق ہے"۔

پھر عزیزوں کی باری آئی۔ کڑیل جوان علی اکبرؑ جو ہمشکل پیغمبرؐ بھی تھا۔ اس کے پیش کرتے وقت حسینؑ نے خدا کو گواہ بھی کیا۔ پھر عقیل و جعفر کی اولاد۔ حسن مجتبیٰؑ کے یتیم اور باپ کی یادگار اپنے بھائیوں کو یکے بعد دیگرے راہِ خدا میں نثار کرتے رہے۔

جب قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباس بھی شہید ہو گئے اور کوئی لڑنے کے قابل شخص باقی نہ رہا تو امامؑ نے رباب کی گود میں ایک گوہر بے بہا کو تلاش کیا۔ شیرخوار بچہ جو میدانِ جنگ میں آنے کے قابل نہ تھا اور یقیناً پیاس سے بھی جاں بلب تھا۔ امامؑ نے دونوں ہاتھوں پر لیا۔ بے شک بادشاہوں کی بارگاہ میں نذر کا طریقہ بھی یہی ہے۔ بچے کی پیاس بجھ گئی۔ اگر حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ اپنے ہاتھ میں خنجر لے کر فرزند کے گلے پر پھرا کر امتحانِ محبت میں ثابت قدم رہے تو حسینؑ کی شان بھی خاص ہے کہ دشمن کے تیر کے سامنے اپنے ہاتھوں پر بچہ کو سنبھالے رہے۔ نہ ابراہیمؑ کے ہاتھوں کو لرزش تھی نہ حسینؑ کے ہاتھوں کو جنبش۔ ہاں اتنا فرق ضرور

ہے کہ ابراہیمؑ نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لی تھی۔ مگر کیا کہنا خلیلِ کربلا کا۔ یہاں قاتل بھی آنکھوں کے سامنے تھا اور اُس کی کھنچی ہوئی کمان بھی۔ چلہ میں جُڑا ہوا تیر بھی اور معصوم کا گلا بھی۔ مگر پھر بھی نہ دل میں لرزہ ہُوا نہ ہاتھ میں جنبش۔

بر کفِ شاہ علی اصغرؑ ناداں جاں داد   تیر سہ شعبہ کُجا گردنِ معصوم کُجا

یہ آخری نذرانہ تھا جو حسینؑ بارگاہِ الٰہی میں پیش کر سکتے تھے اب کون تھا؟ بس خود امام حسینؑ۔ آخر آپ نے اپنے نفسِ عزیز کا ہدیہ بھی پیش کیا۔

مجاہدینِ راہِ خدا کے تذکرہ میں آیت نے دُو چیزوں کا تذکرہ کیا ہے۔ نفوس اور اموال۔ امام حسینؑ نے نفوس کو اس طرح دیا اور اموال وُہ بعدِ عصر دشمنوں نے اس طرح لوٹے کہ بی بیوں کے سروں سے چادریں اور زیور تک اُتار لیے۔ مگر ایک خاص قسم کی قربانی کا امام حسینؑ کے یہاں اضافہ ہو گیا۔ اور وُہ عزّتِ ناموس کی قربانی ہے۔ امامؑ اپنے ساتھ اہلِ حرم کو اسی لیے لائے تھے۔ کون عزّت دار اہلِ حرم۔ آپ جانتے ہیں وُہ خاندانِ رسالت کی بی بیاں جو دونوں جہان کی شہزادیاں تھیں۔ وُہ بی بیاں جن کی ماں کا جنازہ شب کو اُٹھا تھا۔ بعدِ شہادتِ حسینؑ کیا ہوا؟ کوفہ اور شام کے بازار، ابنِ زیاد اور یزید کے بھرے ہوئے دربار اور علیؑ و فاطمہؑ کی اولاد رسن بستہ۔

عجیب بے کسی اور بے بسی کا وقت تھا۔ دربارِ یزید میں وُہ جب

ایک شامی سُرخ رنگ کا کھڑا ہُوا ہے اور اُس نے یزید سے کہا ہے :۔
"اے یزید میں اس مالِ غنیمت سے کچھ نہیں مانگتا مگر یہ لڑکی جو سامنے کھڑی ہے مجھ کو دے دے"۔ اور اشارہ کیا فاطمہ کبریٰ کی طرف۔

یہ سُننا تھا کہ فاطمہ کبریٰؑ دوڑ کر جناب زینبؑ سے لپٹ گئیں اور کہا کیوں پھوپھی! کیا یہ بھی ہونے والا ہے کہ اولادِ رسولؐ کنیزی میں دی جائے؟ جناب زینبؑ نے فرمایا کیا مجال یزید کی جو تمہیں کنیزی میں دے۔ یزید کو غصہ آگیا۔ کہا اے زینبؑ اگر میں اسے دے دوں تو کیا کرو گی؟

جناب زینبؑ نے فرمایا اس صورت میں ہمارے نانا اور باپ کے دین سے خارج ہو جائے گا۔ اب اس کا جو جواب یزید نے دیا ہے نہ عرض کروں گا۔ مگر یہ سمجھ لیجئے کہ یزید کی سخت کلامی پر آخر زینب کو کہنا پڑا کہ اے یزید تُو نے ہمارے وارثوں کو تو قتل کر ہی دیا۔ اب ہم تیرے بس میں ہیں جو چاہے ظلم و ستم کر لے۔

مجلس ششم

محرم کی چھٹی تاریخ!

قَالَ اللّٰہُ سُبحَانَہٗ فِی کِتَابِہِ الکَرِیمِ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیمٍ o

یہ حضرتِ احدیت کا ارشاد ہے اپنے حبیب خاص سردارِ انبیاءؑ حضرت محمدؐ مصطفٰےؐ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب کر کے "یقیناً تم ایک بڑے خلق کے درجہ پر ہو"

یہ سند ہے خالق کی طرف سے پیغمبرؐ کے کمال اخلاق کی۔ اور ہونا بھی چاہیے کیونکہ پیغمبرؐ وہ تھا جو نوعِ انسانی کی تکمیل کے لیے سب سے آخری نمونہ تھا۔ یعنی جتنی جتنی بشریت کی ترقی ہوتی رہی اُتنی اُتنی کامل مثال پیش کی جاتی رہی۔

ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ کی تعلیمی مثالوں کے بعد جب آپ ہمارے پیغمبرؐ کو خاتم النبیین بنا کر بھیجا تو ضروری ہے کہ آپؐ کمالِ انسانی کا بہترین مجسمہ ہوں۔ ورنہ قدرت کا انتخاب غلط ہوگا، مقصدِ تعلیم حاصل نہ ہوگا۔

ناقص نمونے سامنے آکر خلق کی نگاہ میں پستی پیدا ہوگی جس سے

خالق کے کمالِ ذات پر بھی دھبا آئے گا۔ اس لیے ضرورت ہوئی
آخری معلّم اور راہبر ایسا ہی ہو جو کمالِ انسانی کی آخری منزل پہ ہو
تاکہ اُس کو دیکھ کر عالمِ امکان کے افراد ہر اُس نقطہ پر پہنچ سکیں جس
تک امکان کے ظرف میں صلاحیت ہے اور جہاں تک پہنچانا اس
کائنات کا خالق کو مدّنظر ہو سکتا ہے۔

اس لیے جہاں قرآن نے آپ کے آخری معلّم ہونے کا پیغام
سُنایا ان الفاظ میں کہ مَا کَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِکُمْ
وَلٰکِنْ رَّسُوْلَ اللّٰہِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ اسی کے ساتھ آپ کے
کمالِ اخلاق کی گواہی دی ان الفاظ میں کہ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ
تم بڑے خلق کے درجہ پر فائز ہو۔ یہ ایسی سند ہے جس سے بڑھ
کر کوئی سند نہیں ہو سکتی۔

معلوم ہونا چاہیے کہ الفاظ کی قدر و قیمت متکلّم کے اختلاف سے
بدل جاتی ہے۔ کوئی چھوٹا شخص اگر کسی چیز کو "عظیم" کہہ دے تو یہ اُس
کی حقیقی عظمت کی دلیل نہیں۔ کیونکہ یہ خود چھوٹا، اس کی نگاہ چھوٹی،
اس کا پیمانہ غور و فکر چھوٹا، کوتاہ نظر، اطلاع محدود، حوصلہ تنگ۔
اس لیے ہر ذرا سی بڑی چیز کو بھی یہ بڑا سمجھتا اور کہہ دیتا ہے۔ لیکن
اگر کوئی بڑا کسی شے کو بڑا کہے تو معلوم ہوگا کہ یہ واقعی کوئی بڑی چیز
ہے۔ عالمِ تصوّر و خیال میں خالق سے بزرگ و برتر کوئی ہستی نہیں۔
اُسے آپ ہر نماز میں کتنی ہی دفعہ اور ہر اذان میں چھ مرتبہ اللہ اکبر کہتے

ہیں یعنی وُہ سب سے بڑا ہے۔ اُس کا کیا تذکرہ۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ یعنی خدا کی ذراسی رضامندی، ہر بڑی چیز سے بڑی ہے۔

دُنیا میں جن جن چیزوں میں عظمت پیدا ہوتی ہے وُہ یا اُس کے فائدہ کی اُمید اُس سے بہت ہے یا اس لیے کہ اُس کا ڈر زیادہ ہے، یا اس لیے کہ کمالاتِ ذاتی اُس کے بہت ہیں۔ خالق کی ذات ہر اعتبار سے عظمت کا آخری نقطہ ہے۔ اُمیدوں کی دُنیا اُس کی ذات پر ختم ہے یہاں تک کہ اُس سے نااُمیدی کفر۔ اِنَّهٗ لَا يَايْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُوْنَ۔ "یقیناً نہیں مایوس ہوتے خدا کی رحمت سے مگر کافر لوگ"۔

بلکہ کفار کو بھی دنیا میں فضل وکرم، احسان وانعام کی اُمید ہو سکتی ہے تو اُسی کی ذات سے کیونکہ وُہ کافر کو بھی اس کی زندگی میں اپنے فیض سے محروم نہیں کرتا۔ وَسِعَتْ رَحْمَتُهٗ كُلَّ شَيْءٍ "اُس کی رحمت ہمہ گیر ہے"۔

رہ گیا خوف تو ظاہر ہے کہ اللہ سے بڑھ کر کسی کا خوف بھی نہیں ہو سکتا۔

وَاللّٰهُ اَشَدُّ بَاْسًا وَّاَشَدُّ تَنْكِيْلًا۔ "خدا سب سے بڑھ کر ہے سختی میں اور سب سے بڑھ کر ہے سزا دینے میں۔ اور متنبہ کیا گیا ہے اُن کو جو دُوسروں سے ڈرتے ہیں کہ وَلَا تَخَافُوْهُمْ

وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ "لوگوں سے نہ ڈرو خدا سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو"۔

اس کے بعد ذاتی کمالات۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر کمال کا مرکز ہے بلکہ کمال کا عالمِ امکان میں وجود ہی نہیں۔ کامل تو بس ایک ہی ذات ہے اور وہ خدائے احد کی ذات ہے۔

معلوم ہوا کہ ہر حیثیت سے عظمت کا مالک ہے تو خداوند عالم۔ پھر وہ خداوندِ عظیم اگر کسی شے کو عظیم کہہ دے تو ماننا پڑے گا کہ اِس جنس کی تمام چیزوں میں اُس سے بڑھ کر عظیم کوئی نہیں۔

اب آپ کو اندازہ ہُوا کہ رسولؐ کے خلق کو جو وُہ تاکید و تحقیق کے ساتھ کہہ رہا ہے کہ یقیناً، ضرور بالضرور یہ عظیم خُلق ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نوعِ بشر میں از آدمؑ تا اختتامِ عالم کوئی ایسا نہیں ہُوا جو ہمارے رسُول حضرت محمدؐ مصطفےٰ صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے مثل خلق رکھتا ہو۔

خلق کے معنی سمجھنے میں ہمارے اردو محاورہ کی بناء پر ذرا دھوکا ہوتا ہے۔

ہم جب خلق کی لفظ سُنتے ہیں تو ہمارا ذہن منتقل ہوتا ہے اس مفہوم کی طرف کہ انسان کا برتاؤ دُوسروں کے ساتھ بہت خاکسارانہ ہو۔ وُہ ہر ایک سے جُھک کر ملے اور تواضع سے پیش آئے۔ مگر عربی زبان کے محاورہ میں خلق کے معنی اِتنے

ہی نہیں ہیں۔ اس کا مفہوم بہت زیادہ وسیع ہے۔ انسانی اوصاف دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اُس کے ارادہ واختیار سے متعلق نہیں ہیں جیسے خط و خال، شکل و شمائل، رنگ و رُوپ قد و قامت، ذہانت و ذکاوت وغیرہ۔ یہ صفتیں جو قدرتی کسی میں پائی جاتی ہیں اُن کو کہتے ہیں خلق۔ دُوسری وُہ صفتیں ہوتی ہیں جن کے ماتحت ارادی افعال انجام پاتے ہیں۔ جیسے سچائی، امانتداری فیاضی وغیرہ۔ اس طرح کے اوصاف کو خُلق کہتے ہیں۔ خواہ وُہ انفرادی زندگی سے متعلق ہوں خواہ اجتماعی زندگی سے۔ اب آپ نے خیال کیا کہ رسُولؐ کو جو خُلقِ عظیم پر فائز کہا گیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زندگی کے ہر شعبہ میں آپ کے عملی کمال کی تصدیق کی گئی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ آپ کی اخلاقی بلندی ایک ایسے نقطہ پر تھی جہاں دوست دشمن کی گردنیں خم تھیں۔ بچپنے سے آپ کی سچائی اور امانتداری کا یہ حال تھا کہ مشرکینِ قریش نے آپؐ کا نام رکھ لیا تھا صادقؐ اور امینؐ اور آپ کو ان دونوں لقبوں کے ساتھ ملقب کر کے گویا آپ کی رسالت کا پیشگی کلمہ پڑھ لیا تھا۔ کیونکہ صادق جو ہے اُس کا دعوٰے جھوٹا کیسے ہو سکتا ہے، اور جو امین ہو وُہ پیغام پہنچانے میں خیانت کب کر سکتا ہے۔ آپ کو صادق اور امین ماننا اُس امر کا اقرار تھا کہ جو دعوٰے آپ کریں وُہ صحیح ہے

اور جو پیغام آپ پہنچائیں وُہ درست ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ذاتی اغراض سرِ تسلیم خم کرنے سے سدِّ راہ ہوں۔ لیکن دِل کا یقین کسی کے بس کی بات نہیں۔ اسی لیے قرآن نے صاف کہہ دیا کہ جَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ۔ "انہوں نے صاف زبان سے انکار کیا ہے حالانکہ دلوں کو اُن کے یقین ہے"۔ وہی کہ جو آپ کے خلاف سرتوڑ کوشش کرتے تھے اور آپ کی صدا کے خاموش کرنے بلکہ آپ کی ہستی کو فنا کرنے کا بیڑا اُٹھائے ہوئے تھے۔ وہی دل سے یقین رکھتے تھے کہ یہ خدا کے سچّے رسُولؐ ہیں۔ اور آپ کی امانتداری پر ایمان اتنا مستحکم تھا کہ وہی لوگ جو آپ کے خُون کے پیاسے تھے اور دشمن تھے۔ اُن کی بھی امانتیں آپ کے پاس موجود تھیں اُس وقت تک کہ جب تک آپ نے مکّہ معظّمہ سے ہجرت فرمائی ہے۔ اور یہ مشرکین قریش کی امانتیں ہی تھیں جن کی خاطر آپ نے اپنے ابنِ عم حضرت علی مرتضےٰؑ کو اپنی جگہ پر مکّہ میں چھوڑ دیا اور فرمایا کہ جب تک مشرکین کی امانتیں واپس نہ کر لینا میرے پاس نہ آنا۔ علیؑ نے جب امانتیں واپس کر لیں تب مدینہ تشریف لے گئے۔

یہ آپ کے اخلاق کی مقناطیسی کشش ہی تھی جو دلوں کو آپ کی طرف جذب کرتی تھی۔ ایک طرف مروت، تواضع، علم تحمل، عفو، کرم، سخاوت یہ صفتیں آپ پر ختم تھیں۔ دُوسری

طرف استقلال، ثباتِ قدم، جفاکشی اور قوتِ قلب میں آپ کا نظیر نہ تھا۔

حقوق اللہ ایک طرف ادا ہو رہے تھے اور حقوق النّاس دوسری جانب۔ خدا کی عبادت اس طرح کی کہ پیروں پر ورم آگیا آخر آیت اتری طٰہٰ مَآ اَنزَلنَا عَلَیکَ القُرآنَ لِتَشقیٰ ۔ "اے طیبؑ وطاہر! ہم نے تم پر قرآن اس لئے نہیں نازل کیا ہے کہ تم اس قدر تکلیف برداشت کرو۔"

دُوسروں کے ساتھ برتاؤ کا یہ عالم کہ جس سے ملاقات ہوتی تھی حضرتؐ خود سلام میں ابتدا فرماتے تھے۔ کشادہ پیشانی اور بشاشت سے گفتگو فرماتے۔ راستہ چلنے میں پسِ پُشت سے اگر کوئی آواز دیتا تو آپ صرف چہرہ موڑ کر اس کی طرف دیکھ لینا اخلاق کے خلاف سمجھتے۔ بلکہ پُورے قد سے اُس کی طرف متوجہ ہوتے تھے۔ آج ہم میں کوئی بڑا آدمی ہو جاتا ہے تو مُنہ سے کر بات نہیں کرتا، ابتدا بہ اسلام کا کیا ذکر۔ جنابِ سلام میں بھی تکلف ہوتا ہے۔ مگر رسُولؐ کی اپنی عظمت کے ساتھ یہ حالت تھی۔

صحرا نشین عرب آپ کے پاس آتے اور طرح طرح کی بدتمیزیاں بھی کرتے تھے۔ مگر وُہ خلقِ مجسّم تیوریوں پر بل نہ لاتا تھا۔

یہ اور بات ہے کہ چونکہ آپ کا فرض دوسروں کی اصلاح بھی ہے اس لیے دُوسرے موقع پر قرآن نے ان بدتہذیبیوں پر متنبہ بھی کر دیا ہے۔ مگر خود اُسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ بروقتِ واقعہ خود رسُولؐ ان باتوں پر خفا نہ ہوتے تھے۔ مثلاً ارشاد ہُوا:۔
اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ۝ "اے رسُولؐ یہ لوگ جو تمہیں حجروں کے پیچھے سے آواز دیا کرتے ہیں اکثر ان میں سے سمجھ نہیں رکھتے"۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب پیغمبرؐ بیت الشرف میں ہوتے تھے تو یہ جاہلِ عرب مکان کے پیچھے سے زور زور سے چلّا کر آوازہ دیتے تھے۔ یہ کتنی خلافِ تہذیب بات ہے مگر رسُولؐ برداشت کرتے تھے۔ لوگ آپ کی اُس عظمت کا احساس نہ کرتے ہُوئے آپ کو بجائے رسُولؐ اللہ کہنے کے آپ کا نام لے کر پکارتے تھے کہ یا محمدؐ! پیغمبرؐ اُن کی بات سُننے اور جواب دیتے تھے۔ یہ نہیں کہ آپ چیں بہ جبیں ہوتے یا ڈانٹ دیتے۔ ہاں اصلاح کی خاطر قرآن نے کہہ دیا کہ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَیْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا۔ "اے مسلمانو! پیغمبرؐ کے پکارنے کا انداز بالکل ویسا نہ رکھو جیسے آپس میں ایک دُوسرے کو پُکارتے ہو"۔ انتہا ہے کہ حرمسراء کا احترام مدنظر نہ رکھتے تھے بغیر پکارے درّانہ گھس جاتے۔ حضرتؐ اس پر بھی کوئی سخت برتاؤ

نہ کرتے تھے۔ قرآن نے اس پر بھی تنبیہ کی۔ ارشاد ہوا:۔ اِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَاسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ۰ اگر تمہیں ازواجِ رسولؐ سے کچھ مانگنا ہو تو پردہ کے پیچھے سے مانگا کرو"۔ پیغمبرؐ کے پاس لوگ کھانا کھاتے آتے تو وقت سے پہلے آجاتے تھے اور برتنوں پر نظر رکھتے تھے کہ کب کھانا تیار ہو اور ہم کو ملے۔ جب کھانا کھا چکتے تھے تو خواہ مخواہ گھنٹوں باتیں کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبرؐ کے فرائض اور اشغال کتنے اہم تھے آپ کو سخت تکلیف ہوتی تھی مگر یہ کبھی نہیں ہوتا تھا کہ آپ اُن سے صاف کہہ دیں کہ میرے کاموں کا حرج ہو رہا ہے چلے جاؤ۔ قرآن مجید نے اس کا تذکرہ کیا۔ ارشاد ہوا:۔ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا وَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا۔ "جب بلائے جاؤ تو اندر آؤ اور جب کھانے سے فراغت ہو تو متفرق ہو جاؤ"۔ پھر اُن کے رویّہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:۔ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ۔ "یہ طریقہ رسولؐ کو اذیت کا باعث ہوتا ہے مگر وہ شرم کے مارے تم سے کہتا نہیں مگر اللہ کو حق بات کہنے سے کوئی شرم نہیں"۔ اب آپ کیا اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم میں کے بڑے افراد میں کوئی شائبہ بھی رسولؐ کے اس اخلاق کا پایا جاتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ اغیار بلکہ دشمنوں کے ساتھ آپ کے درگزر اور عفو کا کیا ذکر

ہو سکتا ہے۔ واقعہ مشہور ہے کہ مکہ معظمہ میں ایک عورت تھی کہ جب آپ کا اُس کے مکان کی طرف سے گزر ہوتا تھا تو وُہ خس و خاشاک بالا خانے سے آپ کے سر مبارک پر ڈال دیتی تھی۔ اس کو عرصہ گزر گیا۔ اتفاق سے وُہ بیمار ہو گئی۔ حضرتؐ کا جو اُس طرف سے گزر ہوا تو اُسے نہ پایا۔ دریافت فرمایا۔ معلوم ہُوا کہ وُہ بیمار ہے۔ حضرتؐ اُس کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ جب اُس کی نظر آپؐ پر دُور سے پڑی وُہ سمجھی کہ حضرتؐ انتقام لینے آئے ہیں۔ کہنے لگی اب تم مجھ سے بدلا لینے آئے ہو جب میں بستر بیماری پر اس عالم میں پڑی ہوئی ہوں۔ حضرتؐ نے فرمایا کنیز خدا میں تجھ سے بدلا لینے نہیں آیا ہوں، بلکہ میں نے سُنا کہ تُو بیمار ہے تو میں تیری عیادت کے لیے آیا ہوں۔ یہ سُننا تھا کہ اُس کا دل نورِ ایمان سے منوّر ہُوا اور اُس نے کہا اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ "میں گواہی دیتی ہوں کہ خدا وحدہٗ لا شریک ہے اور آپ اُس کے سچے رسولؐ ہیں"۔

حضرت کی مساوات پسندی کا یہ عالم تھا کہ مرض الموت میں منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا اگر میرے ہاتھ سے کسی کو ایذا پہنچی ہو تو وُہ ابھی مجھ سے بدلا لے لے۔ سوادہ بن قیس مجمع میں سے کھڑا ہو گیا۔ اور عرض کیا یا رسولؐ اللہ ایک روز آپ ناقہ

پر سوار تشریف لیے جا رہے تھے۔ آپ کے ہاتھ میں تازیانہ تھا میں ناقہ کے قریب سے ہو کر گزرا اس حالت میں کہ آپ ناقہ کو تازیانہ لگا رہے تھے، وہ تازیانہ مجھ پر پڑ گیا اور مجھ کو اس سے تکلیف ہوئی۔ میں اُس کا قصاص چاہتا ہوں۔ حضرتؐ نے بلالؓ سے فرمایا کہ جا کر ہمارا تازیانہ ممشوق لے آؤ۔ بلالؓ گئے اصحاب میں بے چینی پیدا ہو گئی کہ اس بیماری کی حالت میں رسُولؐ اس تکلیف کو کیسے برداشت کریں گے۔ سب سمجھا رہے ہیں مگر سوادہ کسی طرح رضامند نہیں ہوتا۔ آخر تازیانہ آیا، رسُولؐ نے اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ فرمایا لے بھائی قصاص لے لے۔ سوادہ نے عرض کیا یا رسُولؐ اللہ جب آپؐ نے میرے جسم پر تازیانہ لگایا تھا تو اُس وقت میرے جسم پر پیراہن نہ تھا، آپ نے برہنہ جسم پر تازیانہ لگایا تھا۔ یہ سُننا تھا کہ حضرتؐ نے پُشت مبارک سے لباس کو ہٹا دیا۔ جسم مبارک کا کھلنا تھا کہ سوادہ نے بڑھ کر مُہرِ نبوّت کو بوسہ دیا اور کہا کیا مجال میری جو اس جسم سے تازیانہ مس کروں۔

اچھا ہُوا کہ سوادہ نے پہلے اپنے قصاص سے درگزر نہ کیا، دُنیا کو معلوم تو ہو گیا کہ ہمارا پیغمبرؐ عمل کے کس نقطہ پر ہے۔ وہؐ جو کہتا ہے اُسے عمل کے آخری حد تک پہنچا دیتا ہے۔

سوادہ کی نگاہ میں رسُولؐ کے جسم کی عزت تھی۔ اُس نے

پُشت مبارک کی زیارت کے بعد یہ جرأت نہ کی کہ وُہ تازیانہ کو مس کرے۔ ہائے افسوس! کون سمجھائے کربلا والوں کو کہ حُسینؑ کا جسم پاک جس پر تلواریں اور نیزے پڑ رہے ہیں۔ درحقیقت رسُولؐ ہی کا جسم ہے۔ مگر افسوس اُمّتِ رسُولؐ نے اُس جسم کی کوئی عزّت نہ کی۔ تلواروں سے ٹکڑے کر ڈالا۔

وُہ رسُولؐ اللہ کے اخلاق ہی کی بلندی تھی جو آپ کو تمام دُنیا سے بالاتر قرار دیئے ہُوئے تھی۔

اخلاق میں ایک مقناطیسی کشش ہوتی ہے جو اغیار تک کے دلوں کو جذب کر لیتی ہے اور ایک جذبۂ محبّت پیدا کر دیتی ہے پھر اُن لوگوں کا کیا ذکر جو اُس شخص کے ساتھ کوئی قریبی تعلق بھی رکھتے ہوں۔ اسی کا نتیجہ ہے رسُولؐ دُنیا کے محبوب اور ہر دلعزیز تھے۔ آپ کی وفات سے مدینہ میں ایک کہرام برپا تھا اور بہت سے اشخاص پر اُس کا غیر معمولی اثر ہُوا تھا۔ بلالؓ کا یہ عالم تھا کہ جب سے رسُولؐ کی وفات ہوئی مدینہ میں رہنا ترک کر دیا۔ شام کی طرف چلے گئے تھے۔ بہت دن وہاں رہے۔ آخر خواب میں دیکھا رسُولؐ اللہ کو کہ حضرت فرماتے ہیں اے بلالؓ! تم ہمارے روضہ کی زیارت کو نہیں آتے۔ یہ سُنکر بلالؓ مدینۂ رسُولؐ میں روضہ کی زیارت کو آئے۔ تاریخ میں لکھا ہے وُہ عجب دن تھا جب بلالؓ مدینہ میں پہنچے اور روضۂ

رسولؐ پر گئے ہیں تمام مدینہ کی گلی کوچوں میں کہرام برپا تھا، اور گھروں سے عورتوں کے رونے کی آوازیں بلند تھیں۔

رسولؐ کے ایک غلامؓ کا اثر تھا جو مدینہ سے کچھ مدت کے لیے چلا گیا تھا، اور اب اپنے آقا کے روضہ پر آیا۔ حالانکہ بلالؓ صحیح و سالم واپس آئے تھے۔ کیا اس موقع پر یاد دلاؤں کہ رسولؐ کا نواسا اپنے گھربار سمیت مدینہ سے جدا ہوتا ہے مگر افسوس! اُنسے صحیح و سلامت اپنے نانا کے روضہ پر واپس آنا نصیب نہ ہُوا نہ اُس کے ساتھ کوئی جوان، بُوڑھا، بچہ آیا۔ صرف ایک بیمارؑ فرزند اور کچھ لاوارث بی بیاں واپس ہوئیں اور روضۂ رسولؐ پر وارد ہوئیں۔ جب ہی توام کلثوم نے مدینہ کو مخاطب کر کے کہا تھا:

خَرَجْنَا مِنْكَ بِالْأَهْلِيْنَ جَمْعًا
رَجَعْنَا لَا رِجَالَ وَلَا بَنِيْنَا

"اے مدینے! جب ہم تجھ میں سے گئے تھے تو عزیز سب موجود تھے۔ اب واپس آئے ہیں اس حال میں کہ نہ مرد باقی رہے اور نہ گودیاں بچوں سے آباد رہیں۔"

رسولؐ کی وفات کا سب سے زیادہ اثر آپ کے اہلبیتؑ پر پڑا۔ سیدۂ عالمؑ تو اس غم میں روتے روتے دنیا سے سدھاریں دیگر اہلبیتؑ کو بھی ہمیشہ رسولؐ کی یاد رہی۔

ظاہر ہے کہ جب محبوب آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو اُس وقت اُس کی ہر معمولی سے معمولی یادگار کو سر آنکھوں پر رکھا جاتا ہے اور سینہ سے لگایا جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک شخص کی بہترین یادگار اُس کی تصویر ہے۔ قدرت نے اہلبیتؑ کے گھر میں رسولؐ کے بعد آپ کی ایک مکمّل تصویر پیدا کر دی تھی جو نہ صرف صورت میں بلکہ سیرت میں بھی رسول اللہؐ کی تصویر تھی۔ وہ حسینؑ بن علیؑ کے نورِ نظر، ام لیلیٰ کی اُمّیدوں کی دُنیا علی اکبرؑ تھے۔ جب ہی تو جس وقت علی اکبرؑ امام سے رخصت ہونے لگے تو حضرتؑ نے اپنے ہاتھ اُٹھائے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا:۔ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ عَلٰی ھٰؤُلَآءِ الْقَوْمِ فَقَدْ بَرَزَ اِلَیْھِمْ غُلَامٌ اَشْبَہُ النَّاسِ خَلْقًا وَّخُلْقًا وَّمَنْطِقًا بِرَسُوْلِكَ وَکُنَّا اِذَا اشْتَقْنَا اِلٰی نَبِیِّكَ نَظَرْنَا اِلٰی وَجْھِہٖ

”خداوندا گواہ رہنا اس قوم کے ظلم پر کہ اب جاتا ہے ان کی طرف وہ نوجوان جو صورت و سیرت و گفتار میں تیرے رسولؐ سے مشابہ ہے۔ خداوندا جب ہم مشتاق ہوتے تھے تیرے رسولؐ کی زیارت کے تو اس کے چہرہ کو دیکھ لیتے تھے“۔

یہ الفاظ امامؑ نے زبان پر شاید اس لیے جاری کیے تھے کہ مخالف جماعت کو معلوم ہو جائے کہ یہ جو ہمارے سامنے آ رہا ہے یہ کوئی اور نہیں، رسول اللہؐ کی تصویر ہے۔

امام حسینؑ کا مقصد کربلا میں یہی تھا کہ وُہ دُنیا کے سامنے دشمن کے دعوائے اسلام کی حقیقت کھول دیں۔ وُہ بتلادیں کہ اس اسلام کی نقاب کے نیچے کون سی لا مذہبیت کی تصویریں ہیں۔ تاکہ ان کے افعال کی ذمّہ داری کبھی اسلام کے سر عائد نہ ہو، اور اُن کے فسق وفجور سے اسلام کے دامن پر دھبّا نہ آئے۔ اس کے لیے امام حسینؑ نے اسباب فراہم کیے۔ ایسے عابد و زاہد نماز گزار اصحاب اپنے ساتھ لیے جن پر کسی مسلمان کا ہاتھ نہیں اُٹھ سکتا۔ ان میں صحابۂ رسُولؐ بھی تھے، ان میں حافظانِ قرآن بھی تھے، ان میں راویانِ حدیث بھی تھے۔ پہلے امام حسینؑ نے ان ہی کو میدانِ جنگ میں بھیجا کہ کیا ان کے قتل کرنے میں دشمن کو کوئی جھجک ہوتی ہے۔ دُنیا نے دیکھ لیا کہ مسلم بن عوسجہ ایسے کبیر السّن صحابی کے قتل کرنے میں دشمنوں کو عذر نہ ہوا۔ اور بریر ہمدانی جو حافظِ قرآن تھے، اور سیّد القراء لقب رکھتے تھے اُن کو میدانِ جنگ میں دیکھ کر فوج میں یہ چرچا بھی ہُوا کہ یہ تو وہی بریر ہیں جو ہمارے بچوں کو قرآن کا درس دیتے تھے۔ مگر آخر وہی بریر تھے، اور ان بے دین مسلمانوں کی تلواریں۔ جب اصحاب سب کام آگئے اور عزیزوں کی باری آئی تو امام حسینؑ نے اپنے فرزند علی اکبرؑ کو میدان میں بھیجا۔

اکثر معتبر تواریخ سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ سب سے پہلے اعزا میں اسی شہزادہ کی باری تھی اور اس لحاظ سے قدر کے قابل ہے آپ کی ترتیب کہ آپ پانچویں محرم تک تو اصحاب کا ماتم کرتے ہیں۔ پھر جب عزیزوں پر نوحہ شروع کرتے ہیں تو سب سے پہلے چھٹی محرم کو آپ نے علی اکبرؑ کے لیے مخصوص قرار دیا ہے پھر اس کے بعد قاسم اور ابوالفضل العباس اور آخری روز سیّدالشہداء۔ ضرور یہ سوچی سمجھی بات معلوم ہوتی ہے اور یہ اسی روایت کو دیکھتے ہوئے کہ سب سے پہلے اعزا میں امام حسینؑ نے اپنے کڑیل جوان ہی کا داغ اُٹھایا ہے آپ بھی سب سے پہلے حسینؑ کو علی اکبرؑ ہی کا پُرسا دیتے ہیں۔

امام حسینؑ نے علی اکبر کو میدانِ جنگ میں بھیج کر ان مسلمانوں کے اسلام کا بڑا سخت امتحان لے لیا۔

آپ ذرا اپنے اسلامی جذبات کو سامنے رکھ کر دیکھئے۔

آج کوئی چیز رسولؐ اللہ صلے اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی طرف منسوب سُنائی دیتی ہے۔ یہاں تک کہ مُوئے مبارک، نعل شریف یا کوئی مرقع۔ شبیہ تو مسلمان شہروں سے اُس کی زیارت کو جاتے ہیں، اُسے سر آنکھوں پر رکھتے ہیں اور اُس کی عزّت کرتے ہیں۔ کوئی مُسلمان ایسا نہیں ہو سکتا جو ان میں سے کسی چیز کے ساتھ کوئی معمولی سی بے ادبی کرے اور اگر ایسا کرے تو دُوسرے

خوش عقیدہ مسلمان مارنے مرنے پر تیار ہو جائیں گے۔

اب آپ دیکھئے اُس اسلام والوں کی جماعت کو جس کے سامنے رسُولؐ اللہ کی جیتی جاگتی تصویر پیش ہو رہی تھی۔ اور امام حسینؑ نے اسی لیے کہ قطع حجت قطع ہو جائے یہ خیال کرنے کو نہ ہو کہ اُس جماعت نے رسُولؐ اللہ کو دیکھا نہ تھا۔ وُہ اس سے واقف نہ تھے کہ یہ رسُولؐ کی تصویر ہے۔ آپ نے علی اکبرؑ کی رخصت کے وقت انتہائی خلوص کے ساتھ اپنے مالک کی بارگاہ میں مناجات کے طور پر یہ الفاظ جاری کیے تھے تاکہ سب کو معلوم ہو جائے کہ خود حسینؑ اپنے فرزند کو صرف فرزند نہیں سمجھتے، بلکہ وُہ اُس کو اس لیے عزیز رکھتے ہیں کہ وُہ رسُولؐ کی تصویر ہے۔ صرف صورت میں نہیں بلکہ سیرت میں بھی۔ اس کے ساتھ لب و لہجہ اور طرز گفتار میں بھی۔ ایسی مکمل تصویر جس کے متعلق آپ فرماتے ہیں کہ جب رسُولؐ اللہ کی زیارت کا ہمیں اشتیاق ہوتا تھا تو علی اکبر کے چہرہ کو دیکھ لیتے تھے اور یہ سمجھ لیتے تھے کہ ہم نے رسُولؐ کی زیارت کی۔ اب کیا آپ سُنیں گے کہ مسلمانوں نے اس رسُولؐ کی تصویر کی کیا قدر کی؟ منتظر رہیے ابھی آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

حسینؑ کو اِس تصویرِ رسُولؐ کی جدائی کا اِتنا قلق تھا کہ اِس مناجات کے بعد آپ نے عمر سعد کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا

يَا ابْنَ سَعْدٍ قَطَعَ اللهُ رَحِمَكَ كَمَا قَطَعْتَ رَحِمِي وَلَمْ تَحْفَظْنِي فِي رَسُولِ اللهِ۔

"اے عمرِ سعد! خدا کرے تیری کوئی رعایت نہ کی جائے جس طرح تُونے میری قرابتداری کی رعایت نہ کی اور رسول اللہ کی خاطر سے جو میرے حقوق ہیں اُن کا کوئی لحاظ نہ کیا"۔

علی اکبرؑ میدانِ جنگ میں آئے اور رجز پڑھ کر بہادرانہ حملہ کیا۔ کیا کہنا اُس شاہزادہ کی شجاعت کا۔ اُن کی شجاعت تو وُہ تھی جس کا شام کے دربار میں امیر معاویہ کی زبان پر تذکرہ آیا ہے اُس وقت جب اُنھوں نے خود اہلِ دربار سے مخاطب ہو کر پوچھا کہ تمہارے نزدیک خلافت کا مستحق کون ہے؟

دربار کے خوشامدی آدمی کیا کہتے سوائے اس کے کہ آپ ہی مستحقِ خلافت ہیں۔ مگر "حق بر زبان جاری" امیرِ شام نے لوگوں سے کہا تم نے انصاف کی بات نہیں کہی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت خلافت کے حقدار حسینؑ کے فرزند علی اکبرؑ ہیں جن میں بنی ہاشم کی شجاعت ہے، بنی اُمیہ کی سخاوت ہے اور بنی ثقیف کا رُعب و داب ہے۔ اسی شجاعت کا اثر تھا کہ آپ نے کربلا میں ایسی جنگ کی جس کے متعلق تاریخ میں یہ فقرہ ہے کہ "مقتولین کی کثرت سے دشمن کی فوج چیخ اُٹھی"۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ جوانی اور اس پر اتنی شدید جنگ۔ دوپہر کا وقت، عرب کی دھوپ

اور آفتاب کی تمازت۔ اس کے ساتھ کچھ زخم بھی آ گئے ہوں گے اب علی اکبرؑ کو پیاس کی انتہا نہ تھی۔ اس موقع پر یہ روایت مشہور ہے کہ شاہزادہ امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یَا اَبَتِ الْعَطَشُ قَدْ قَتَلَنِیْ وَثِقْلُ الْحَدِیْدِ اَجْهَدَنِیْ فَهَلْ اِلٰی شَرْبَةٍ مِّنَ الْمَآءِ سَبِیْلٌ۔

"بابا پیاس نے اب مجھے مار ڈالا اور گرانی آہن نے میری جان پر بنا دی ہے۔ کیا اس وقت تھوڑا سا پانی ممکن ہے"۔

کچھ عجب نہیں کہ ایسا ہُوا ہو۔ اور یہ طریقہ بھی دُنیا کو امامؑ کی بے کسی اور مظلومیت کے دکھلانے کا ہو۔ خبر لیجئے امام حسینؑ کے دل کی۔ وُہ علی اکبرؑ کو کیا جواب دیں۔ وُہ سخی بن سخی جس نے کبھی کسی سائل کو نا امید واپس نہیں کیا۔ جس کے پاس کوئی سائل آتا تھا، تو اُس کا مطلب سُننے سے پہلے ہی کہہ دیتے تھے حَاجَتُكَ مَقْضِيَّةٌ "تیرا مطلب پُورا ہو جائے گا" یہ اس لیے کہ اُسے جواب کا انتظار نہ اُٹھانا پڑے۔ آج اُسی کریم النفس کے سامنے کوئی اور نہیں جوان بیٹا جو کار نمایاں کر کے آیا ہے، سوالِ آب پیش کرتا ہے۔ حضرتؑ نے انتہائی مایوسی کے ساتھ فرمایا "پانی کہاں ہے؟ جاؤ تمہارے دادا رسولؐ اللہ آبِ کوثر سے تمہیں سیراب کریں گے"۔

یہ شہادت کی تحریک تھی جسے سُن کر پھر علی اکبرؑ میدانِ جہاد میں آئے اور سخت جنگ کی۔ افسوس مرہ بن منقذ عبدی ملعون نے غضب

کیا، دھوکا دے کر ایک نیزہ پُشت پر لگایا جس سے علی اکبر زمین پر آ گئے۔ دشمنوں نے چاروں طرف سے گھیر لیا اور شاہزادہ کے جسم کے تلواروں سے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

امامؑ کے دِل پر اس شہادت کا بڑا اثر ہُوا۔ آپ فرماتے تھے عَلَی الدُّنیَا بَعدَكَ العَفَا۔ "اے بیٹا تیرے بعد دُنیا کی زندگی پر خاک ہے"۔

جب حسینؑ ایسے صابر انسان پر یہ اثر تھا تو لیلیٰ کے دل پر کیا گذری ہوگی۔ مگر کیا کہنا ثبات و استقلال کا کہ کوئی تاریخ نہیں بتلاتی کہ ام لیلیٰ گھبرا کے خیمہ سے باہر نکل آئی ہوں۔

اہل حرم کے سخت سے سخت موقعوں پر پردہ کا خیال رکھا ہے۔ انہوں نے خود اختیاری طور پر ہرگز کسی وقت خیمہ کو نہیں چھوڑا۔ مگر کیا کرتیں اُس وقت جب خیمے رہے ہی نہ۔ خیموں میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ مجبوراً بی بیاں خیموں سے نکلیں نَاشِرَاتِ الشُّعُورِ لَاطِمَاتِ الوُجُوہِ۔ "بال سروں کے بکھرے ہوئے منہ پر طمانچے لگاتی ہوئی"۔

وَا محمّدَاہُ وَا علیّاہُ کی صدا تھی اور زمین و آسمان میں تہلکہ۔

سرِ حسینؑ نیزہ پر تھا اور صدا بلند تھی۔

اَلَا قُتِلَ الحُسَینُ بِکَربَلَا اَلَا ذُبِحَ الحُسَینُ بِکَربَلَا

مجلس ہفتم

محرم کی ساتویں تاریخ

قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَتَعَالٰی فِیْ کِتَابِہِ الْکَرِیْمِ اَیْنَمَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ۔

ارشادِ حضرت باری ہے کہ "جہاں بھی تم ہو موت تم تک پہنچ جائے گی اگرچہ تم بڑے مضبوط قلعوں میں بھی محفوظ ہو۔"

یہ ہے عام اعلان اُس ناگزیر شے کے متعلق جس کا نام ہے مُوت جس سے نہ کوئی بادشاہ مستثنیٰ ہے نہ کوئی گدا۔ سب کے لیے اس زندگی کو ختم کر کے اس دُنیا سے رخصت ہونا، اس رُوح و بدن کے علاقہ کا قطع ہونا، اور اس جسم سے جان کا علیحدہ ہونا ہے۔ اسی کا نام ہے موت۔ اس کی حقیقت میں کتنا ہی اختلاف ہو مگر حقیقت میں کسی کو شبہہ نہیں۔ وُہ یقینی ہے اور ہر ایک کو اس کا خیال دل و دماغ میں موجود ملتا ہے۔ مگر مختلف اشخاص کے لحاظ سے اس کی کیفیتیں جُداگانہ ہوتی ہیں۔ کچھ وُہ ہیں جن کا دل اس دُنیا کی آرائشوں میں اُلجھا ہے اور جمالِ حاضر اُن کی نگاہ کا مرکزِ آخر ہے۔

اُن کی نظر میں موت کا خیال اس تمام نعمت و لذّت سے علیحدگی کا پیغام ہے اس لیے وُہ موت کا نام سُن کر لرزتے ہیں۔ اور اُس سے نفرت کرتے ہیں۔ کچھ وُہ ہیں جنہوں نے دُنیا کے لیے بڑی محنت و مشقت کی ہے۔ عمارتیں بنوائی ہیں دفینے رکھے ہیں، اور خزانے جمع کیے ہیں۔ وُہ جب موت کا تصوّر کرتے ہیں تو حسرت کے ساتھ اپنے مال و دولت اور تمام محنت و مشقت کی بربادی کا مرقع آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اس لیے موت سے ڈرتے ہیں۔ کچھ وُہ ہیں جن کے دل میں اس دُنیا کی آیندہ زندگی کے لیے بڑے توقعات ہیں۔ انہوں نے منصوبے باندھ رکھے ہیں اور آرزوؤں کی ایک دُنیا آباد کر رکھی ہے۔ موت اُن کے لیے اُن تمام آرزوؤں کی پامالی کا نام ہے اس لیے موت سے گھبراتے ہیں۔ ایک جماعت وُہ ہے جو سمجھتی ہے کہ اس دُنیا کے بعد کوئی دوسرا عالم ہے جہاں اچھے اعمال کی جزا اور بُرے اعمال کی سزا ہوگی۔ لیکن اُنہوں نے اُس عالم کے لیے کوئی سامان نہیں کیا ہے۔ ہمیشہ بداعمالیوں میں زندگی گزاری ہے اور آخرت کے معاملہ کو سبک سمجھا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دُنیا سے رخصت ہوئے تو ہماری بداعمالیوں کا جائزہ لیا جائے گا اور اُس پر سزا دی جائے گی۔ یہ اس لیے زیادہ دنوں تک دُنیا میں رہنا چاہتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے یہ

اُس آخرت کی پاداشس سے بچے رہیں اور دُنیا میں آرام کی زندگی گزارتے رہیں۔ ان تمام جماعتوں کے لیے موت کا خیال بڑا تکلیف دِہ ہے اور وہ اس کو بڑی مصیبت سمجھتے ہیں۔

مگر ایک جماعت ایسی ہے جس نے اس دنیا کو ہمیشہ سرائے فانی سمجھا۔ انہوں نے آخرت کی منزل کو پیش نظر رکھا اور اُس کے لیے سامان فراہم کرتے رہے۔ اُنہوں نے دُنیا میں تکلیفیں برداشت کیں اور مصیبتیں جھیلیں۔ فرائض کی انجام دہی میں ناگوار حالات کا مقابلہ کیا۔ یہ سب اس لیے کہ آخرت میں کامیابی حاصل ہو اور وہاں راحت و آرام نصیب ہو۔

اُن کے لیے مَوت ایک نوید ہے جس کے وُہ منتظر رہتے ہیں۔ وُہ موت سے گھبراتے نہیں بلکہ مَوت کی طرف خود پیش قدمی کرتے ہیں بشرطیکہ وُہ مَوت اُن کے خالق کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔ ایسی صورت سے مَوت نہیں جو نعمتِ حیات کی ناقدری کا اظہار کرے۔ اِسی لیے شریعتِ اسلام نے خودکشی کو جُرم قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا: لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ "اپنے ہاتھوں اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔"

بلکہ اگر فرائضِ عبادت میں سے کوئی عبادت کسی وقت جان کے خطرہ کا باعث ہو تو عبادت ساقط ہو جائے گی اور اُس کا بجا لانا جائز نہ ہو گا۔

اس حکم سے کوئی مستثنیٰ نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی جان اور جان سے زیادہ عزیز مقصد باہم ٹکرا جائے یعنی جان کے جانے سے کسی بڑے مقصد کی حفاظت ہوتی ہو تو اس موقع پر جان دینا بہترین عبادت ہوتا ہے۔ اسی کا نام ہے شہادت اور وہ میدان جہاد کی منزل ہے جہاں انسان اپنی عزیز جان کو قربانی کے لیے پیش کرتا ہے اُس مذہب و ملت کے لیے جس کی حفاظت اس قربانی پر موقوف ہے۔

یہاں دنیادار لوگوں کے قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں جن کے دل اس عالم کی خوشی اور زیب و زینت میں اُلجھے ہیں اور جو مُوت کو بڑی مصیبت سمجھتے ہیں۔ لیکن اولیائے خدا اس موقع کا کشادہ پیشانی کے ساتھ استقبال کرتے ہیں کہ مُوت بہر حال آنا ہے۔ پھر کیا کہنا اُس مُوت کا جو راہِ خدا میں ہو جہاں روح و بدن کا باہمی تعلق کا منقطع ہونا رضائے الٰہی کے ساتھ ہم رشتہ ہو۔

ان کے الفاظ اُن کے تعبیرات موت کی یاد، اور اُس کے ساتھ ایک وابستگی کا پتہ دیتے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السّلام کے وُہ الفاظ جو آپ نے مکّۂ معظمہ سے روانگی کے وقت اپنے خطبہ میں ارشاد فرمائے تھے:۔ خُطَّ الْمَوْتِ عَلٰی ابْنِ اٰدَمَ مَخَطَّ الْقِلَادَةِ عَلٰی جِیْدِ الْفَتَاةِ (یعنی، مُوت انسان کے گلوگیر ہے اُس طرح جیسے گردن بند جوان عورت کی

گردن میں ہوتا ہے"۔

مقصود تو اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے گلے میں موت کا پھندا ہے اور وہ ایک دن دنیا سے رخصت ضرور ہوگا۔ مگر اس کا بیان پیش خیمہ اسی کا ہے کہ موت سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں جبکہ ایک نہ ایک دن موت آئے ہی گی تو وہ خدا کی راہ میں کیوں نہ ہو، دین حق کی حفاظت میں کیوں نہ ہو۔ اس کے علاوہ یہ دیکھئے کہ آپ نے اس کا تذکرہ کتنے دلکش انداز میں کیا ہے جس سے انسان کی طبیعت کو احساس ہوتا ہے کہ موت ناگوار طبع چیز نہیں ہے بلکہ خود حسین اور دیدہ زیب ہے یہ قاعدہ ہے کہ انسان کے ذہن سے الفاظ وہی نکلتے ہیں جیسے خیالات اُس کے دماغ میں راسخ ہوتے ہیں۔

امام حسینؑ اُس گھرانے کے ایک بزرگ فرد تھے جہاں موت سے کبھی خوف نہیں کیا گیا، بلکہ بہادری سے مرنا زندگی سے زیادہ پسند رہا۔

خود قرآن مجید میں اولیائے خدا کی یہ پہچان قرار دی ہے کہ وہ موت کے آرزومند ہوتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے یہود سے مخاطب ہو کر:۔

اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَاۗءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝

"اگر تمہارا یہ خیال صحیح ہے کہ تم خدا کے دوست ہو تو پھر موت کے آرزو مند ہو"۔

کیونکہ موت علائق دُنیا سے کنارہ کشی کے ساتھ مرکز رُوحانیت سے قرب کا باعث ہے اس لیے اُسے لقائے الٰہی کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ایک دوست کے لیے لقائے دوست سے بڑھ کر کوئی شے باعثِ مسرت نہیں ہو سکتی بشرطیکہ وُہ اُس ذریعہ سے ہو جو خدا کی منشاء کے مطابق ہے۔

اسی لیے امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ کا قول تھا کہ لَا اُبَالِی اَوَقَعْتُ عَلَی الْمَوْتِ اَمْ وَقَعَ الْمَوْتُ عَلَیَّ۔ "مجھے کوئی پرواہ نہیں کہ مَیں موت کے اُوپر جا رہا ہوں یا موت میرے اُوپر آ رہی ہے"۔

ایک جگہ فرماتے ہیں اِنَّ ابْنَ اَبِی طَالِبٍ اٰنَسُ بِالْمَوْتِ مِنَ الطِّفْلِ بِثَدْیِ اُمِّہٖ۔

"میں موت کے ساتھ اُس سے زیادہ مانوس ہوں جتنا کہ بچہ کو آغوشِ مادر سے اُنس ہوتا ہے"۔

اب آپ یاد کیجئے اُس آیت قرآنی کو کہ اگر تم اللہ کے مخصوص دوست ہو تو موت کی آرزو کرو۔ کیا بچّہ کو آغوشِ مادر سے بڑھ کر کسی چیز کی آرزو ہوتی ہے۔

اس مثال سے موت کے انتہائی اشتیاق کا پتہ لگتا ہے مگر موت وہی جو عزّت اور شجاعت کے ساتھ ہو۔ وُہ اس طرح کی

موت کو ناپسند کرتے تھے جو بزدلی کے ساتھ بسترِ راحت پر ہو۔ ایک مرتبہ اصحاب سے خطاب کر کے فرمایا:۔

اِنْ لَمْ تُقْتَلُوْا تَمُوْتُوْا وَالَّذِیْ نَفْسُ اَبِیْ طَالِبٍ بِیَدِہٖ لَاَلْفُ ضَرْبَۃٍ بِالسَّیْفِ عَلَی الرَّاْسِ اَھْوَنُ مِنْ مِیْتَۃٍ الْفِرَاشِ۔

"دیکھو اگر قتل نہ ہوئے تو یوں موت آئے گی۔ اور قسم ہے اُس کی جس کے قبضۂ قدرت میں علیؑ کی جان ہے کہ ہزار ضربتیں تلوار کی سر پر پڑ جانا آسان ہے فرشِ خواب پر ایڑیاں رگڑ کر مرنے سے۔"

یہ باتیں فقط زبانی تھوڑی تھیں۔ امیرالمومنینؑ کا طرزِ عمل بھی اس کا مظہر تھا، اور بچپنے سے اُن کو تعلیم بھی یہی ملی تھی۔ اُس وقت جب رسالت مآب صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم شعب ابی طالب میں محصور تھے، اور یہ خطرہ تھا کہ کسی وقت مشرکین رات کے وقت حملہ کر کے رسولؐ کو قتل نہ کر دیں، تو حضرت ابوطالبؑ نے یہ انتظام کیا تھا کہ وہ رات کو رسولؐ کو ایک جگہ ایک بستر پر نہیں رہنے دیتے تھے بلکہ کبھی رسولؐ کو اُن کے بستر سے ہٹا کر اپنی اولاد کی جگہ پر اور اپنی اولاد کو رسولؐ کے بستر پر لٹا دیا کرتے تھے۔ یہ اس لیے کہ اگر رسولؐ کو قتل کرنے کے لیے لوگ آئیں تو کوئی بیٹا میرا قتل ہو جائے مگر رسولؐ پر آنچ نہ آئے۔ اس طرح اکثر علیؑ کو فدیۂ رسولؐ بن کر بسترِ رسولؐ پر سونے کا موقع حاصل ہو چکا تھا۔ اُس کے

ابتدائے شباب میں جب ہر انسان کو اپنی جان عزیز ہوتی ہے اس خطرہ کے موقع پر جبکہ دشمنوں نے رسولؐ کے قتل پر قسمیں کھائی تھیں جس کے نتیجہ میں پیغمبرؐ کو وطن چھوڑنا پڑا۔ علی بن ابی طالبؑ ہی وہ تھے جو اطمینان کے ساتھ رسولؐ کے بستر پر سونے کو تیار ہو گئے۔ شب کا وقت، مکہ سے تشریف لے جا چکے ہیں اور خانۂ رسولؐ کے گرد خون کے پیاسے دشمن تلواریں کھینچے ہوئے مجتمع ہیں اور علی بن ابی طالب اطمینان سے رسولؐ کی چادر اوڑھے ہوئے آرام کی نیند سو رہے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ راہِ حق میں موت کو کوئی چیز نہیں سمجھتے۔ ایسا ہی اطمینان تھا جب تو آیت مدح کرتی ہوئی اُتری کہ "ایسے بھی لوگ دنیا میں ہیں جو اپنے نفس کو خدا کے ہاتھ فروخت کر ڈالتے ہیں"۔ آیت لب و لہجہ خود نازہ کا انداز رکھتا ہے۔ پھر کیا تعجب اس موقع پر فرشتے امیرالمومنینؑ کو مبارکباد دے رہے ہوں کہ کیا کہنا تمہارا کون ہے تمہارے مثل کہ تمہارے عمل پر خالق خود ناز کرتا ہے۔

اس کے بعد اُس وقت جب اُحد میں جنگ بگڑی ہے اور مسلمانوں نے میدانِ جنگ خالی کر دیا ہے اور رسولؐ زخمی ہو کر ایک نشیب میں گر گئے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ قَد قُتِلَ مُحَمَّدٌ کی آواز بھی بلند ہو گئی تھی اُس وقت علیؑ ہی تھے جو ہزاروں دشمنوں میں شمشیر زنی کر رہے تھے، صاف ظاہر تھا کہ یہ موت کو

موت ہی نہیں سمجھتے اور اپنی جان کی پرواہ ہی نہیں رکھتے۔

وہ اُس مَوت کو جو مظلومیت کے ساتھ حق کی راہ میں ہو، مصیبت نہیں بلکہ ایک نعمت سمجھتے تھے۔ اسی لیے اُس موقع پر جب رسالت مآبؐ نے خبرِ شہادت سُنائی ہے اور فرمایا ہے کہ اے علیؑ تم اِس پر صبر کرو گے تو عرض کی کہ یا رسُولؐ اللہ! میرے مذاق میں یہ صبر کا محل نہیں ہے بلکہ مَیں اس پر شکرِ خدا ادا کروں گا۔ دیکھئے یہ وُہ منزل ہے جہاں حضرت اسمٰعیلؑ نظر نہیں آتے۔ خود قرآن مجید میں تذکرہ ہے اس موقع کا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اسماعیلؑ سے اپنا خواب بیان کیا:۔ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُكَ فَانۡظُرۡ مَا ذَا تَرٰی۔ "میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ اب تمہاری کیا رائے ہے"۔ اسماعیلؑ نے کہا تھا یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ ○ اے بابا جو آپ کو حکم ہوا ہے بجا لائیے آپ مجھے انشاء اللہ صابرین میں سے پائے گا"۔

کوئی شبہہ نہیں کہ اسماعیلؑ ایک بلند مرتبہ پر فائز ہیں اپنی گردن کو کٹانے پر خوشی سے رضامند ہونا ہر شخص کا کام نہیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ کا لب ولہجہ اطمینانِ نفس کا بھی پتہ دیتا ہے۔ کوئی اضطراب نہیں، کوئی گھبراہٹ نہیں۔ پھر بھی اِتنا ہے

کہ اسماعیلؑ نے اس کو مصیبت سمجھا جب ہی وہ اس موقع پر "صبر" کے لفظ کا استعمال کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "آپ مجھے صابرین کی منزل میں پائیے گا"۔ مگر علی بن ابی طالبؑ کا قول ہے کہ یہ صبر کا موقع نہیں ہے بلکہ شکر کی جگہ ہے۔ اُن کے نزدیک موت مصیبت نہیں بلکہ ایک بڑی نعمت ہے جبکہ وہ حکمِ خدا سے ہو۔

یہ تعلیمات آپ کے سامنے ہیں۔ یاد رکھئے کہ جو قوم ان تعلیمات کو پیشِ نظر رکھے اور دل میں جگہ دے لے اس میں بزدلی کا گزر نہیں ہو سکتا۔

شرع میں موت کی آرزو بے شک مذموم ہے مگر وہ اس حیثیت سے کہ خدا کی دی ہوئی زندگی سے ناراضگی اور تقدیرِ خداوندی سے بیزاری ہو۔ مگر خداوندِ عالم کی جانب سے راہِ خدا میں اپنی موت مقرر ہونے کا اشتیاق خاصانِ خدا کا مخصوص امتیاز ہے۔

امیرالمومنینؑ نے تمام عمر اس کے اشتیاق میں بسر کی۔ اسی لیے تو جب مسجدِ کوفہ میں آپ کے سرِ مبارک پر ضربت لگی، حسنینؑ مطلع ہو کر مسجد میں آئے تو دیکھا کہ آپ خاکِ زمینِ مسجد سے اٹھا اٹھا کر زخمِ سر میں ڈالتے ہیں اور فرما رہے ہیں فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ۔ "خدا کی قسم میں کامیاب ہوا"۔

کربلا میں ہر شخص کو موت کا اشتیاق تھا۔ ایک طرف اصحاب

کا یہ عالم کہ صبحِ عاشور عبدالرحمٰن بن عبدرب انصاری اور بریر ہمدانی خیمہ کے دروازہ پر ہیں، اور بریر ہنس ہنس کر مذاق کی باتیں کر رہے ہیں۔ عبدالرحمٰن نے کہا بریر آج مذاق کا دن نہیں ہے تو بریر کہتے ہیں آج سے بڑھ کر تو کوئی دن خوشی کا ہو ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ ابھی ابھی تھوڑی دیر میں ہم لڑ بھڑ کر نصرتِ فرزندِ رسولؐ میں اپنی جان نثار کریں گے اور جنت میں پہنچیں گے۔

دُوسری طرف اعزا! ان میں سے کس کا تذکرہ کروں ــ! اچھا سُنئے! آج کی تاریخ آپ اُسی شاہزادہ کا تذکرہ سُننے کے منتظر بھی ہیں۔ امام فردہ کی مرادوں کی دُنیا قاسم بن الحسنؑ ــ! اس شاہزادہ کا سن کیا تھا؟ بس اتنا کہ روایت میں ہے لَمۡ یَبۡلُغَ الۡحُلُمُ" ابھی حدِ بلوغ کو نہ پہنچے تھے"۔ سمجھ لیجئے بارہ تیرہ برس۔ اس چھوٹے سے سِن و سال میں موت کا کتنا اشتیاق تھا، ملاحظہ کیجئے تاسخ کی روایت۔ شبِ عاشور جب امامؑ نے خطبہ ارشاد فرمایا اور سب کو شہادت کی اطلاع دی تو قاسمؑ خدمت میں حاضر ہوئے۔ عرض کی چچا جان! ہمارا بھی نام دفترِ شہدا میں ہے؟ ہم بھی قتل ہوں گے؟ امام کو شاید قاسم کا امتحان منظور ہوا یا وُہ دنیا کو اپنے خاندان کے ہر بچہ تک کے زاویۂ نظر سے واقف بنانا چاہتے تھے۔ فرمایا کَیۡفَ الۡمَوۡتُ عِنۡدَكَ؟ اے قاسم تمہارے نزدیک موت کیسی ہے؟ عرض کیا اَحۡلٰی مِنَ الۡعَسَلِ

"اے چچا شہد سے زیادہ شیریں"۔ یہ ہے ایک بے ساختہ جواب جس میں بچپنے کا بھولا پن بھی نمایاں ہے۔ حضرتؑ نے قاسم کا اطمینان دیکھ کر فرمایا ہاں تم بھی شہید ہو گے اور تمہارا چھوٹا بھائی علی اصغرؑ بھی۔ قاسم نے اپنی شہادت کی خبر کو تو بہت اطمینان سے سُنا، مگر علی اصغر کا ذکر سُنتے ہی بے چین ہو گئے۔ غیرتِ ہاشمی کو جوش آ گیا۔ کہنے لگے چچا! یہ علی اصغر کیسے شہید ہو گا کیا اشقیا عورتوں کے خیموں میں چلے جائیں گے؟ امامؑ نے فرمایا نہیں میری زندگی میں تو ایسا نہیں ہو گا مگر اُس وقت کہ جب اُس پر پیاس کا غلبہ ہو گا یہانتک کہ اُس کی رُوح شدّتِ عطش سے خشک ہو گئی ہو گی اُس وقت میرے ہاتھوں پر وُہ تیرِ ستم کا نشانہ بنے گا۔

دیکھا آپ نے۔ قاسم کے لیے مَوت کوئی چیز نہ تھی مگر اہلِ حرم کی بے پردگی کا تصوّر وُہ تھا جس نے شاہزادہ کو مضطرب کر دیا۔ یہ طاقت سیّد سجادؑ کے نفس کی تھی جو حسینیؑ مقصد کی خاطر انہوں نے اس ضبط و تحمّل سے کام لیا کہ ماں، بہنوں، پھوپھیوں کے ساتھ قید ہو کر شہر بہ شہر پھرنا گوارا کر لیا۔

امامؑ نے تسکین دی اور قاسم کو تسکین ہو گئی کہ علی اصغرؑ کی شہادت کے موقع پر اعدا خیموں میں داخل نہ ہو سکیں گے۔ مگر کیا خبر تھی جناب قاسم کو کہ امام حسینؑ کی شہادت کے بعد اُن خیموں میں دشمنوں کا ہجوم ہو گا۔ مال و اسباب غارت ہو رہا ہو گا

ور اتنہا ہے کہ مخدراتِ عصمت کے سروں پر چادریں نہ رہیں گی
تنہا ہے کہ نامراد دولہن تک کے سر سے چادر چھین لی گئی، اور
پشت پر نیزہ کی نوک سے اذیت بھی دی گئی جس سے وُہ شاہزادی
منہ کے بل زمین پر گر پڑی اور غش آگیا۔ غش سے افاقہ ہُوا تو
چاہنے والی پھوپھی کو سرہانے دیکھا کہہ رہی تھیں کہ اے بیٹی اُٹھو،
خیمہ میں چلو دیکھیں تمہارے بھائی پر کیا گزری۔ فاطمہ نے غش سے
آنکھیں کھولیں۔ عرض کیا پھوپھی جان میں کیسے چلوں میرے تو
سر پر چادر نہیں۔ جناب زینبؑ نے حسرت سے فرمایا عَمَّتُكِ
مِثْلُكِ۔" اے بیٹی! تیری پھوپھی تیری ہی طرح سر برہنہ ہے۔
دشمنوں کے ظلم نے میرے سر پر بھی چادر نہیں چھوڑی ہے۔

وُہ تھا قاسم کا ولولہ اور جوش جو عاشورہ کے دن سے پہلے ان
کے سینہ میں تلاطم برپا کیے تھا۔ پھر عاشورہ کے دن گیا ممکن تھا کہ وُہ
جہاد کے لیے بے چین نہ ہوتے۔ مگر امامؑ نے کسی شہید کے طلب
رخصت پر اجازت دینے میں اس کے پہلے اتنا توقف نہیں
فرمایا تھا کہ جتنا قاسم کے اجازت دینے میں آپ نے توقف فرمایا
یہاں تک کہ شبیہہ پیغمبر علی اکبرؑ جب میدانِ جہاد کی طرف جانے
لگے تو امامؑ نے روکا نہیں۔ مگر قاسم کو حضرتؑ کسی طرح اجازت
دیتے ہی نہ تھے۔ ممکن ہے یہ سمجھتے ہوں کہ یہ حسنؑ مجتبےٰ کی نشانی

اور اُن کی امانت ہیں یا یہ کہ قاسم کی بیوہ ماں کا خیال دامنگیر ہو، یا اس لیے کہ یہ شاہزادہ ابھی حدِ تکلیف تک نہیں پہنچا ہے اور جہاد کا فرض عائد نہیں ہوا ہے۔ اور ممکن ہے امام حسنؑ کی وصیت جس کے بظاہر اسباب اس وقت پورا ہونے کا موقع نہ تھا آپ کو اجازت دینے سے مانع ہو رہی ہو۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ امامؑ نے قاسم کو انتہائی اصرار کے باوجود کسی طرح اجازت نہ دی اس حد تک کہ قاسم کو مایوسی ہو گئی اور وُہ محزون و مغموم ہو کر خیمہ کے ایک گوشہ میں بیٹھ گئے۔ ایک مرتبہ خیال آیا کہ میرے بازو پر ایک تعویذ بندھا ہوا ہے۔ یہ امام حسنؑ نے اپنی وفات کے موقع پر قاسم کے بازو پر باندھ دیا تھا اس لیے کہ قاسم کا سِن اُس وقت تک حد تمیز تک نہیں تھا۔ قاسم نے اس تعویذ کو کھول کر پڑھا، دل کو ڈھارس ہوئی۔ اس میں آج ہی کے دن کی پیشنگوئی تھی، اور قاسم کو اپنی جان نثار کرنے کی ہدایت تھی۔

قاسم یہ تعویذ لیے ہوئے خدمتِ امام میں حاضر ہوئے۔ لیجئے سیدالشہدا مجبور ہو گئے۔ آپ اس وقت تک قاسم کو حضرت امام حسنؑ کی ایک وصیّت کے نفاذ ہی کے خیال سے روک رہے تھے مگر اب قاسم خود حضرت حسنؑ مجتبیٰ کی وصیت سے جاں نثاری پر مامور تھے۔ حسینؑ اب بھتیجے کو کس طرح روکیں

مگر پھر بھی آپ چاہنے والے بھائی کی اُس وصیت کو جو خود آپ سے تھی رائیگاں نہیں کرنا چاہتے تھے۔ آپ نے آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ اچھا تم اپنے پدر بزرگوار کی وصیت پر عمل کرو مگر مجھے بھی تو بھائی کی ایک وصیت ہے اُس کو مجھے پُورا کرنا چاہیئے۔

یہ فرما کر قاسم کا ہاتھ پکڑا اور خیمہ کے اندر لائے۔ تبرکات کے صندوق میں سے بزرگوں کا لباس نکالا اور وُہ قاسم کو پہنا کر اُس صاحبزادی کا جو قاسم کو منسوب تھیں عقد قاسم کے ساتھ پڑھ دیا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ عقد کوئی تقریب خوشی کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہر گز نہیں۔ اس نے مصیبت کی عظمت میں اضافہ کر دیا۔

اندازہ تو کیجئے ماں کے دل کی حسرت کا، وہی جو ابھی ابھی دولہا بنا ہے ابھی ابھی مرنے جا رہا ہے۔ لوگ کہتے ہیں ایک رات کا داماد اور فاطمہ کبریٰ کو ایک رات کی دُولہن کہا جاتا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ وہاں ایک رات کہاں تھی وُہ تو چند گھڑیوں کا رشتہ تھا جو موت کے ہاتھوں قطع ہو رہا تھا۔

قاسم کو شہادت کا شوق تھا اس لیے وُہ دیر تک ٹھہر نہیں سکتے تھے۔ سب سے رخصت ہوئے اور عروس سے رخصت ہو کر خیمہ سے بر آمد ہوئے اور آخری بار سلام وداع کے لیے چچا کی خدمت میں گئے۔ اب تو کوئی انتظار نہیں رہا اب تو مجھ کو اجازتِ جہاد دیجئے امامؑ نے اس وقت شاید بھائی کو یاد کر کے بہت گریہ فرمایا۔ قاسم کے

عمامے کو اپنے ہاتھ سے باندھا اور اُس کے دونوں گوشے سینہ پر لٹکا دیئے اور اُن کے پیراہن کو بصورتِ کفن چاک کر دیا۔

یہ تھا خلعت جو حضور اپنے ہاتھ سے پہنا رہے تھے۔ قاسم میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہوئے۔ انصاف کیجئے جب رخصت کے وقت حسینؑ کی بے چینی کا یہ عالم تھا تو کیا حال ہوا ہوگا اُس وقت جب یہی عزیز بھتیجا مُنہ کے بل زمین پر گرا، اور حسینؑ بھتیجے کی مدد کے لیے پہنچے اور شیر غضب ناک کی طرح حملہ کیا۔ جب مجمع منتشر ہوا تو امام قاسم کے سرہانے کھڑے ہوئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادہ کے جسم سے روح مفارقت کر چکی تھی۔ مدد کا وقت باقی نہ تھا۔ جب ہی تو امام حسرت واندوہ کے ساتھ یہ مرثیہ پڑھنے لگے:۔ عَزَّ وَاللّٰهِ عَلٰى عَمِّكَ اَنْ تَدْعُوْهُ فَلَا يُجِيْبُكَ ثُمَّ لَا يَنْفَعُكَ۔ "اے بیٹا قاسم! بڑا ناگوار ہے تیرے چچا پر یہ امر کہ تو اُسے پکارے اور وُہ تیری خبر نہ لے سکے یا تیری آواز پر آئے مگر تجھے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے"۔

اس کے بعد آپ نے خود قاسم کی لاش کو اُٹھایا اور وہیں کہ جہاں علی اکبر کی لاش موجود تھی قاسم کی لاش کو بھی لا کر لٹا دیا۔

مجلس ہشتم

محرم کی آٹھویں تاریخ

قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔

یقیناً اللہ دوست رکھتا ہے اُن لوگوں کو جو جنگ کرتے ہیں اُس کی راہ میں صف باندھ کر اس طرح کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیواریں ہیں"۔

یہاں وصف ہے اُن ثابت قدم مجاہدین راہِ خدا کا جن کے قدم کو ذرا بھی جنبش نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے افعال و اعمال اُس کے قلب و ضمیر کے تابع ہوتے ہیں۔ اگر دل میں ایمان کامل ہے اور ثبات و اطمینان ہے تو اعضاء و جوارح بھی مطمئن ہوں گے۔ لیکن اگر دل مضطرب ہے اور اعتقاد و یقین مستحکم نہیں تو غیر ممکن ہے کہ سخت مواقع پر قدم جمے رہیں۔ چونکہ عمل کی بُنیاد اور اُس کا دار و مدار ایمان پر ہے اسی لیے قرآن نے جہاں جہاں تعریف

کی ہے اور کامیابی کا مژدہ دیا ہے ہر جگہ پہلے ایمان کا تذکرہ کیا ہے، پھر عمل صالح کا۔ مگر افسوس ہے کہ عام افراد زیادہ تر نقطۂ اعتدال سے افراط یا تفریط کی طرف ہٹ جاتے ہیں۔ اعتقاد و عمل کے معاملہ میں بھی دو جماعتیں ہو گئیں۔ کچھ لوگوں نے اعتقاد کو سب کچھ سمجھ لیا اور عمل کو فروعی چیز سمجھ کر اُسے سُبک خیال کرنے لگے۔ یہ وُہ لوگ ہیں جو کسی مذہب کی طرف انتساب کو اپنی نجات کا ذریعہ خیال کرتے ہیں اور اعمال کی طرف توجہ نہیں دیتے۔

ان کے قدم مشکلات میں ثابت نہ رہیں، راہِ حق میں صعوبتوں کے جھیلنے سے ہچکچائیں، ذرا سی سختی میں زبان و دل کو قابو میں نہ رکھ سکیں، بلکہ ذرا سی لالچ میں خود اپنے ہاتھوں اپنے مذہب کو نقصان پہنچانے پر آمادہ ہو جائیں مگر کہیں گے کہ اس سے کیا ہوتا ہے ہمارا ایمان تو سالم ہے، ہمارا عقیدہ تو مستحکم ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر اُن کا ایمان مستحکم ہوتا تو کبھی اُن کے پَیروں میں لغزش پیدا ہی نہ ہوتی اور یہ عمل کے راستہ میں کمزور نظر نہ آتے۔ اُن کے پَیروں کا ڈگمگانا اور مشکلات میں تھرّا اُٹھنا خود اس کا نتیجہ ہے کہ اُن کے ضمیر میں طاقت اور عقیدہ میں قوت نہیں ہے۔ بس جیسا عمل ہے ویسا ہی ایمان ہے۔ اس لیے نہ اُن کو اپنے عمل پر بھروسا کرنا چاہیئے نہ ایمان پر۔

دُوسرا گروہ ایک ایسا پیدا ہو گیا ہے جس کا خیال ہے کہ انسان کا عمل درُست ہونا چاہیے عقیدہ اُس کا جیسا بھی ہو۔ لیکن یہ خیال بھی حقیقت سے دُور ہے۔ مجموعی طَور پر انسان کے عمل میں استحکام پیدا ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وُہ کسی مُستحکم عقیدہ کے ماتحت نہ ہو۔ یوں لوگوں کے دکھانے کو یا مصالحِ وقت کی بناء پر یا کسی وقتی اندیشہ سے اگر عمل درست نظر بھی آئے تو وُہ عارضی ہو گا۔ اُسے دوام و بقا اور عمومیت کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اُس کی بنیاد کسی مستقل اصول پر نہ ہو گی۔ حقیقت یہ ہے کہ عقیدہ اور عمل لازم و ملزوم ہیں اسی لیے قرآن مجید نے اکثر مقامات پر صاف صاف دونوں کا نام لیا ہے اور مذکورہ آیت میں صرف یقین کامل کے مظاہرہ کا تذکرہ کیا ہے اور یہ ارشاد فرمایا ہے "خدا محبوب رکھتا ہے اُن لوگوں کو جو اُس کی راہ میں یُوں جم کر لڑتے ہیں جیسے سیسہ پلائی ہوئی دیواریں"۔

غور کیجئے توفیِ سَبِیلِہ کے لفظ میں ایمان کا جزو مضمر ہے۔ وُہ انسان جو خدا پر ایمان نہیں رکھتا ہے اُس کا عمل سب کچھ ہو سکتا ہے مگر اس احساس کے ساتھ نہیں ہو سکتا کہ یہ خدا کے راستہ میں ہے، خدا کا راستہ یعنی ایسے مقاصد کے لیے جو خالق کو پسند ہیں اور اُس کی رضامندی کا ذریعہ ہیں۔ ارشاد ہے کہ وُہ جو خدا کی راہ میں جنگ کرتے ہیں اس صورت سے۔ مطلب یہ ہُوا کہ وُہ خود خدا پر ایمان

رکھتے ہیں اور اُس کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے یوں جنگ کرتے ہیں۔ پھر جنگ کی جو شان بیان کی ہے اُس کا بڑا سبب اسی مقصد کا احساس ہے۔ جتنا یہ تصور قوی ہوگا کہ ہم کس کے راستے میں جدوجہد کر رہے ہیں اتنا ہی ثبات و استقلال زیادہ ہوگا۔ ممکن ہے یہی معنی ہوں اس آیت کے جہاں ارشاد ہوتا ہے:۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ۔

"اگر تم اللہ کی نصرت کروگے تو وُہ تمہاری نصرت کرے گا اور تمہیں ثابت قدمی عطا فرمائے گا"۔ شائد مطلب یہ ہو کہ اگر تمہیں یہ احساس ہوگا کہ ہم خداوندی مقاصد کی تکمیل کر رہے ہیں تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ یعنی وجہ خداوندی کا یہ تصور تمہاری فتح وظفر کا باعث ہوگا اور تمہیں ثابت قدم بنا دے گا۔

پیغمبرؐ اسلام پر ایمان لانے والے بہت تھے مگر اس ایمان کے درجے مختلف تھے۔ اور جتنا ایمان اور نصرتِ خداوندی کا خیال زیادہ تھا اُتنا ہی ثبات قدم اور استقلال زیادہ تھا یہاں تک کہ وُہ جو ایمان کے انتہائی کمال کے نقطہ پر پہنچ کر رسولؐ کی زبانی مجسم ایمان بن گیا تھا اُس کے ثبات و استقلال کا یہ عالم تھا کہ کبھی قدم کو جنبش ہوتی ہی نہ تھی۔ اسی کو رسولؐ نے اُن کی خصوصی صفت کی حیثیت سے تعارف کے طور پر ارشاد فرمایا اُس وقت جب خیبر میں علم دینے والے تھے۔ فرمایا:۔

اِنِّیْ لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا کَرَّارًا غَیْرَ فَرَّارٍ یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ یَفْتَحُ اللّٰہُ عَلٰی یَدَیْہِ۔" یہ وہ یادگار حدیث ہے کہ جو ایک طرف تاریخ و سیر کے صفحات پر نمایاں حروف میں ثبت ہے تو دوسری طرف اہلِ ایمان کے دلوں میں نقش ہے۔

موقع وہ تھا کہ مسلمان قلعۂ خیبر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے اور کئی روز یہ اتفاق ہو چکا تھا کہ سردار فوج لے کر گئے اور شکست کھا کر واپس ہوئے۔ اب رسولؐ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ "کل میں عَلم اُس مردِ میدان کو دُوں گا جو پے در پے حملہ کرنے والا ہے اور میدانِ جنگ سے بھاگتا نہیں جو خدا و رسولؐ کو دوست رکھتا ہے اور خدا و رسولؐ اُس کو دوست رکھتے ہیں کرّار غیر فرّار کے ساتھ دیکھئے رسولؐ کا ارشاد آخر میں یُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ۔" اللہ اور اُس کا رسولؐ اُسے دوست رکھتے ہوں گے۔ آپ کو بالکل تفسیر نظر آئے گی آیت کی کہ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ جو جماعت ایسی ثابت قدم ہو کر لڑے کہ گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے وہ اس کی مستحق ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو دوست رکھے جیسا قرآن بتلا رہا ہے، تو یقیناً وہ شخص جو خدا کی راہ میں کبھی اپنی جگہ نہ چھوڑے اور اس لیے کرّار غیر فرار کے لقب کا مستحق ہو وہ بھی اس کا حقدار

ہے کہ اللہ اُس کے ساتھ محبت رکھے۔ اس محبت کا راز اُس کا یہی ثباتِ قدم ہے اور اُس کے ثبات کا راز خود اُس کی خدا سے محبت اور معرفت ہے اس لیے کہ کرّار غیر فرار کے بعد جو دو فقرے ہیں یُحِبُّ اللّٰہَ وَرَسُولَہٗ وَیُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُولُہٗ۔ ان میں سے پہلا یعنی یہ کہ وہ خدا و رسولؐ کو دوست رکھتا ہے "کرار غیر فرار" ہونے کا سبب اور دوسرا یعنی خدا و رسولؐ اُس کو دوست رکھتے ہیں یہ اُسی صفت کا نتیجہ ہے۔ اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین صفتیں باہم دست و گریبان ہیں، رسولؐ نے ان الفاظ میں اوصاف کا ایک مرصّع ہار گوندھا تھا جس کے پہننے کے لیے ہر دل بیچین تھا۔ لوگوں کو پوری رات جاگتے بسر ہو گئی اس اشتیاق میں کہ کل علم ہمیں کو مل جائے۔

رسولؐ کا ایک جاں نثار مجاہد اس جنگ میں موجود نہیں تھا اس بنا پر کہ اس کی آنکھیں رمد آلود تھیں اور وہ چلنے پھرنے سے معذور تھا اس لیے اطمینان تھا کہ وہ مراد نہیں ہو سکتا۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ فضیلت اپنے مرکز کو خود تلاش کرتی ہے۔ اتنے بڑے مجمع میں رسولؐ کی نقاد آنکھوں کو ان تمام صفات کا جامع انسان نظر نہ آیا۔ آخر حکم ہوا کہ بلاؤ علی بن ابی طالبؑ کو۔ لوگوں نے جا کر آپ کو اطلاع دی اور علی حاضر خدمتِ رسولؐ ہوئے۔ رسالت مآبؐ نے آنکھوں میں لعاب دہن لگا کر آنکھوں کو نور دیا اور پھر ہاتھوں میں علم دے دیا

فرمایا جاؤ کفّار سے جنگ کرو۔

یہ علمداری امیرالمومنینؑ کی تاریخ میں یادگار رہے گی ۔ اسلام کے پھریرے پر جو گرد پڑ گئی تھی آپ نے اُس گرد کو جھاڑ دیا اور اسلام کے عَلَم کو سربلند کیا۔

اسی ثبات و استقلال کا نتیجہ تھا کہ پیغمبرؐ کا عَلَم بڑی لڑائیوں میں ہمیشہ علیؑ کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ اور آپ نے اس شان سے ہر موقع پر رسُولؐ کے عَلَم کی عزّت کو محفوظ رکھا کہ یہ منصب آپ سے مخصوص ہو گیا یہاں تک کہ روزِ قیامت بھی رسُولؐ کا عَلَم علیؑ کے ہاتھ میں ہو گا۔ خود رسُولؐ اللہ نے ارشاد فرمایا:۔ عَلِیٌّ حَامِلُ لِوَائِیْ یَوْمُ الْقِیَامَۃِ ۔ " علیؑ ہی میرے عَلَم کو اٹھانے والے ہوں گے قیامت کے دن "۔

یقیناً وہ ایک خاص منظر ہو گا۔ رسالت مآبؐ شاہی عظمت و شکوہ کے ساتھ آگے آگے اور ساتھ حضرت امیرالمومنینؑ عَلَم کے پھریرے کھولے ہوئے اور عَلَم کے نیچے شیعہ و محب اس طرح جیسے شمع کے گرد پروانے اور چاند کے گرد ستارے۔ مبارک ہیں وُہ جو اس عَلَم کے سایہ میں اُس دن رضائے پروردگار کی جنّت میں داخل ہوں۔ مگر یہ وہی لوگ ہیں جو حقیقتہً اُن کی طرف نسبت رکھتے ہوں۔ جو اپنے اعمال سے اُنہی کے پَیرو ثابت ہوں۔ ہم اگر انہیں اپنا مقتدا سمجھتے ہیں تو اس پر نظر رکھنا چاہیے کہ ہم میں اپنے امام کی

غلامی کا اثر ہونا چاہیے ۔ وُہ سخت ترین مواقع پر ثابت قدم رہے ہے
ایسا کہ کرّار غیر فرار لقب ہوگیا ۔ تو ہم ایک ذراسی سختی میں جگہ سے
ہٹنے پر تیار نہ ہوجائیں ۔ نہیں تو ہم فرار لوگوں کے پیرو سمجھے جاسکتے
ہیں حیدر کرّار کے عَلم کے نیچے جنّت میں جانے کے حقدار کہاں ہوں گے ۔

یہ علی بن ابی طالبؑ کی علمداری کی شان تھی ۔ مگر یاد رکھئے کہ
پھر بھی علمدار حضرت علیؑ کا مخصوص لقب نہیں ہوگیا ۔

یہ خصوصیت تو آپ کے فرزند ابوالفضل العبّاس کی ہے ۔ انہوں
نے کچھ اس طرح آخر وقت تک علمداری کی کہ علمداری کا لفظ ہمیشہ
کے لیے ان کے واسطے مخصوص ہوگیا ۔

حسینؑ کو کسی طرح منظور نہ تھا کہ آپ کا علم سرنگوں ہو ۔ عباسؑ
نے اس علم کی آخر وقت تک حفاظت کی اور یہ نیّت کچھ اتنی مستحکم
تھی کہ عباسؑ دُنیا سے رخصت ہوگئے مگر اُن کا علم آج تک بلند ہے
ہر عزاخانہ میں امام حسینؑ کی ضریح کے ساتھ عباس کا نشان موجود ہے
مگر اس عَلم کی شان اور اس کی آن کا قائم رکھنا آپ کا کام ہے ۔ آپ
حسینیؑ ہیں اور عباس کا علم اُٹھاتے ہیں تو عباس کی ھمّت اور وفا
داری کو بھی اپنے عمل سے یاد دلاتے رہئے ۔

یقیناً علم سے فوج کی رونق ہوتی ہے اور ایک لشکر اُس وقت
تک موجود سمجھا جاتا ہے جب تک اُس کا پھریرا ہوا میں لہراتا ہو ۔
اسی وجہ سے روزِ عاشور جب تک ایک آدمی بھی نصرت کرنے والا

فوجِ حسینی میں موجود تھا اُس وقت تک حضرت نے عباسؑ کو میدانِ جنگ میں نہیں بھیجا۔ مگر جب کوئی نہ رہا تو عباس خدمت میں حاضر ہوئے اور جنگ کی اجازت مانگی۔

امامؑ کے دل پر کیا گزری ہو گی؟ کون اندازہ کر سکتا ہے؟ بھائی وُہ بھائی جس سے دل کو سہارا اور بازوؤں کو قوت تھی جس کا حُسن و جمال ضرب المثل تھا اور قوت و طاقت کا شہرہ تھا جس کو دُنیا قمرِ بنی ہاشم کہتی تھی۔ قد و بالا ایسا تھا کہ جب اسپ دو رکابہ پر سوار ہوتے تھے تو پاؤں زمین پر خط دیتے تھے۔ اس کے ساتھ ایمان اور یقین کا یہ عالم تھا کہ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں کَانَ عَمُّنَا الْعَبَّاسُ بْنُ عَلِيٍّ نَافِذَ الْبَصِيْرَةِ صَلْبَ الْإِيْمَانِ۔

"ہمارے چچا عباس بن علی بڑے دیندار اور مستحکم ایمان والے تھے" معصوم کا کسی کے متعلق اتنے الفاظ صرف کر دینا بڑی بات ہے۔ اب ایسا بھائی حسینؑ سے جدا ہو رہا ہے۔ امامؑ نے اپنے بھائی کو حسرت کی نگاہ سے دیکھا اور فرمایا تم میرے علمدار ہو۔ عباس نے عرض کی کہ اب مجھ سے تحمل ممکن نہیں اور زندگی سے سیر ہو گیا ہوں۔ امامؑ نے فرمایا اچھا جاتے ہو تو پانی کی فکر کرنا۔

جناب عباس نے مشک لے لی اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہُوئے۔ قمرِ بنی ہاشم کی یہ شجاعت یادگار ہے کہ ایک اکیلے نے فرات کی محافظ فوج کو جنگ کر کے بھگا دیا، اور اتنی دُور ہٹا دیا کہ اطمینان کے

ساتھ نہر میں گھوڑا ڈالا اور پانی مشک میں بھرا۔

بے شک خود جناب عباسؑ پیاسے تھے اور اس جنگ میں پیاس نے غلبہ کیا ہوگا، ممکن ہے کہ کچھ زخم بھی آگئے ہوں مگر واہ رے عباس کی وفاداری پانی ہاتھ میں لے کر پھینک دیا اور خیال کیا کہ میرے امام تو تین دن کے پیاسے ہیں اور میں اپنے لب پانی سے تر کر لوں۔ پیاسے ہی نہر سے نکل آئے اور بھری ہوئی مشک دوش پر لیے خیامِ حسینی کی طرف روانہ ہوئے۔ فوجِ عمر سعد کو اپنی شکست کا غصّہ تھا اور یہ کد بھی تھی کہ پانی حسینؑ تک کہیں پہنچنے نہ پائے۔

اور حقیقت بھی یہ ہے کہ یہ سب سے بڑا حربہ تھا جو بہادر اور امام کے خلاف استعمال کیا گیا۔ اگر حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں کو پانی مل جاتا تو شاید کربلا کا تاریخی واقعہ اس طرح نہ ہوتا جو اَب ہُوا۔ فوجِ عمر سعد نے عباس کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اس مجمع کی جانیں نثار عباسؑ کی شجاعت پر وُہ کن مشکلات میں گرفتار تھے۔ دوش پر مشک مستقل طور پر مانع تھی اور کہا جاتا ہے کہ علم بھی موجود تھا، اور ضرور ہو گا بھلا کوئی بہادر اس عالم میں لڑا ہے۔ مگر واہ رے شجاعتِ عباس۔ انہوں نے اس عالم میں جنگ شروع کر دی۔ وُہ جوش و خروش سے حملے کر رہے تھے اور یہ رجز پڑھ رہے تھے :۔

لَا اَرْهَبُ الْمَوْتَ اِذَا الْمَوْتُ زَقَا
حَتّٰى اُوَارٰى فِى الْمَصَالِيتَ لَقَا

اِنِّی اَنَا الْعَبَّاسُ اَغْدُوْ بِالسِّقَاءِ وَلَا اَهَابُ الْمَوْتَ یَوْمَ الْمُلْتَقٰی

"میں کبھی موت سے نہیں ڈرتا۔ موت کتنے ہی نعرے لگائے جب تک کہ میں تلواروں کے سایہ میں زمین پر گر نہ جاؤں۔ میں عباس ہوں مشک لے جاؤں گا اور ضرور لے جاؤں گا"۔

دشمنوں نے سمجھ لیا کہ جب تک عباس کے ہاتھ موجود ہیں اُن کا مقابلہ کرنا غیر ممکن ہے۔ لیجئے غضب ہوگیا۔ ایک شقی نے عباسؓ کے ہاتھ پر تلوار ماری۔ جناب عباس کو جہاد کا ولولہ اور بڑھ گیا۔ جوشِ شجاعت میں پھر رجز پڑھنے لگے:۔

وَاللّٰهِ اِنْ قَطَعْتُمْ یَمِیْنِیْ اِنِّیْ اُحَامِیْ اَبَدًا عَنْ دِیْنِیْ

"خدا کی قسم اگر تم نے میرا داہنا ہاتھ قطع کر دیا تو یہ نہ سمجھو کہ میں اپنے دین کی حمایت نہ کروں گا۔ اس فرض کو تو میں ہمیشہ انجام دیتا رہوں گا"۔ اس کے بعد یزید بن ورقاء جہنی لعین نے بائیں ہاتھ پر تلوار لگائی، یہ ہاتھ بھی قطع ہو گیا۔

عزاداران حسین! تاریخ کا یادگار واقعہ ہے یہ کہ روز عاشورہ عمرو بن خالد صیداوی اور اُن کے چند بہادر ساتھیوں نے مل کر ایک ساتھ فوج دشمن پر حملہ کیا اور فوجِ کوفہ نے ان کو چاروں طرف سے گھیر لیا تو امام حسینؑ نے اپنے بھائی عباس کو اُن کی مدد کے لیے بھیجا عباس نے اُن پر حملہ کیا اور زخمی بہادروں کو دشمن کے حلقہ سے نکال لیا اب خود عباس دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں اور ہاتھوں

کے قطع ہو جانے سے بے بس بھی ہو گئے ہیں مگر کون ہے جسے حسینؑ عباس کی مدد کے لیے بھیجیں۔ کاش یہ مجمع اُس وقت موجود ہوتا اور اپنے آقا ابوالفضل العباس کو حلقہ میں لے لیتا۔ دشمنوں کی جرأت بڑھ چکی تھی، ایک شقی آگے بڑھا اور سر پر گرز لگایا۔ حضرت عباس گھوڑے سے زمین پر گرے اور امامؑ کو آواز دی کہ میری خبر لیجئے۔ امامؑ پر اس آواز کا بڑا اثر ہوا۔ آپ جلدی لاش پر گئے۔ دیکھا کہ دونوں ہاتھ قطع ہیں، پیشانی شکستہ ہے، آنکھ پر تیر ہے، زخموں سے چور ہیں۔ امام جھک گئے اور سرہانے بیٹھے، بھائی کی جانکنی کا عالم دیکھتے رہے کون تھا جو حسینؑ کا اس وقت ساتھ دیتا۔ حسینؑ دیکھتے رہے اور عباس کی روح نے جسد سے مفارقت کی۔ اب کوئی نہیں تھا جس کا حسینؑ کو سہارا ہوتا۔ آپ بھائی کی لاش سے اُٹھے اور آگے بڑھے تلوار ہاتھ میں تھی اور بڑے جوش میں داہنے اور بائیں حملہ کر رہے تھے اور دشمن سامنے سے بھاگتے تھے۔ اور آپ فرماتے تھے:-

"بھاگتے کہاں ہو تم نے میرے بھائی کو تو مار ڈالا۔ بھاگتے کہاں ہو تم نے میرے بازو کو تو شکستہ کر دیا"

مجلس نہم

محرّم کی نویں تاریخ!

قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ کَمْ مِّنْ فِئَۃٍ قَلِیْلَۃٍ غَلَبَتْ فِئَۃً کَثِیْرَۃً بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ٥

یہ آیت ہے اُس موقع کی جب طالوت اپنے لشکر سمیت کفار کے مقابلہ کے لیے نکلے ہیں اور اُن کے لشکر کی نظر دشمنوں کی فوج پر پڑی تو بہت سے ساتھ والے گھبرا گئے۔ کہنے لگے کہ ہم ہرگز جالوت اور اس کی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

اُسی وقت اُن لوگوں نے جو خدا پر اعتقاد رکھتے تھے کہا کہ ہمیں اپنی قلت سے ہرگز نا امید نہیں ہونا چاہیے۔ اکثر کم جماعت ایسی ہوتی ہے جو بڑی جماعت پر غالب آجاتی ہے صرف خدا کے حکم سے "اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

قرآن مجید نے سابق زمانہ کے اس طرح کے واقعات صرف موجودہ زمانہ والوں کو درس دینے ہی کے لیے بیان کیے ہیں۔

یہاں ایک ایسی جماعت کا نظریہ پیش کیا ہے جو فتح و شکست

معیار کثرت وقلت کو نہیں سمجھتی ۔ بلکہ حقانیت اور خدا کی امداد کو کامیابی کا راز خیال کرتی ہے ۔ یہ صرف خیال نہیں تھا بلکہ نتیجہ نے اُس کو حقیقت ثابت کر دیا اُس وقت جب اکثریت والی جماعت کو شکست ہوئی اور اقلیت غالب آگئی ۔

اب اگر یہ مثال سامنے رہے اور یہ تعلیم پیش نظر ہو تو ہمیں کبھی مادی اسباب کی فراوانی اور تعداد کی کثرت کو تنہا فتح وظفر کا معیار نہیں سمجھنا چاہئے ۔

یاد رکھئے کہ کامیابی اور ناکامی کا تعلق بہت کچھ دل کی قوت اور ناتوانی کے ساتھ ہے ۔ اگر کوئی جماعت اپنی تعداد کی کمی سے پہلے ہی جی چھوڑے اور ہمت ہارے ہوئے ہے تو وہ دشمن کے مقابلہ میں کبھی سر بر نہیں ہو سکتی ۔ لیکن اگر وہ اپنی حقانیت پر بھروسا رکھتی ہے اور خدا کی اعانت و امداد کی آس لگائے ہے اس لیے اُس کے دل میں ہراس کا گزر نہیں ہے تو وہ ثبات و استقلال کے ساتھ مخلف جماعت کے مقابلہ پر قائم رہے گی ۔ اور یہی ثبات و استقلال کامیابی کا ضامن ہے ۔ دیکھئے تو قرآن مجید کی مذکورہ آیت میں اس کا اظہار موجود ہے اکثر کم جماعت والوں کو بڑی جماعت پر غلبہ ہوتا ہے خدا کے حکم سے اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ کامیابی خدا کی امداد کے ساتھ وابستہ ہے پھر ارشاد ہوتا ہے وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ "اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے"۔

صبر کے معنی ہیں "قوتِ برداشت۔

اب دونوں جزوں کو ملا لیجئے۔ کامیابی ہے خدا کے حکم سے، ور خدا ہے اُن لوگوں کے ساتھ جو قوت برداشت رکھتے ہوں۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ کامیابی اور فتحمندی کا تعلق صرف ثبات واستقلال اور قوت برداشت کے ساتھ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خداوند عالم نے دنیا اور آخرت دونوں کے نتائج کو انسانی افعال واعمال کے ساتھ وابستہ قرار دیا ہے۔

وُہ خواہ مخواہ کسی کی امداد نہیں کرتا۔ بے شک جب اپنی طاقتِ عمل سے کوئی قوم اس کی امداد کی مستحق ہو تب وُہ اس کی تائید اور امداد بھی کرتا ہے۔ یہ ہماری غلطی کہ ہم اپنی حالت پر نظر نہیں ڈالتے اور پھر خدا سے امیدوار ہیں کہ وُہ ہماری ہر موقع پر مدد کرے اور ہم کو ہمارے مخالفین پر فتح وظفر عطا کر دے۔

اسلام میں بہت سی لڑائیاں ہوئیں ان میں سب سے پہلی لڑائی جس میں پیغمبرؐ اسلام کے ساتھ انتہائی کم تعداد تھی وُہ بدر ہے۔ اس میں فوجِ اسلام صرف تین سو تیرہ آدمیوں پر مشتمل تھی جبکہ دشمن ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ مقابلہ سخت تھا۔ مگر ثبات واستقلال کا وُہ نتیجہ تھا کہ دشمن مغلوب ہُوا اور اسلام کو فتح حاصل ہوئی۔

اس کے بعد آیا وُہ موقع جب مسلمانوں کی تعداد بہت ہو گئی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد میں کمی پیدا ہوئی اور

عوام کو اپنی کثرت پر گھمنڈ ہو گیا۔ اس غرور کا نتیجہ تھا کہ حُنین میں بڑی سخت شکست نصیب ہوئی۔ خود قدرت نے اس شکست کا سبب یہی قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:۔ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ ۝ "اور یاد کرو حُنین کے دن کو جبکہ تمہاری کثرت تمہارے اترا جانے کا باعث ہوئی تھی تو وہ کثرت تمہیں کچھ فائدہ نہ پہنچا سکی، اور تم پر زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہو گئی تھی۔ پھر تم نے پُشت پھرا کر میدان سے فرار کیا"۔ مگر اس عام شکست کے بعد بھی انگلیوں پر گنے جانے والے بہادروں کا ثباتِ قدم ہی تھا جس نے شکست کو فتح سے بدلا اور پیغمبرؐ کو ظفر یاب بنایا۔ مگر یاد رکھئے کہ اقلیت و اکثریت کے مقابلہ میں جس ثبات و استقلال کا مظاہرہ کربلا کی جنگ میں ہوا ہے ویسا دُنیا کی تاریخ میں بھی نہیں ہوا۔

ہر لڑائی میں ہمیشہ یہی دیکھا گیا کہ کچھ ثابت قدم رہتے ہیں مگر بہت سے ایسے افراد بھی نکل آتے ہیں جن کے قدموں میں لغزش آ گئی۔ مگر یہ معرکۂ کربلا کی خصوصیت ہے کہ یہاں جوان، بوڑھے اور بچے سب استقلال کے ایک نقطہ پہ قائم ہیں جہاں تزلزل کا نشان نہیں ہے۔

پھر کیا کوئی سمجھ سکتا ہے کہ ان کے بارے میں خدا کا دعا

اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ غلط ہو جائے گا۔ خدا صابرین کے ساتھ
ہے۔ اور کربلا والوں سے بڑھ کر صابر کون ہے۔

یقیناً یہ ممکن نہیں کہ خدا ان کا ساتھ چھوڑ دے۔ مگر فتح و شکست
معیار یہاں بدلا ہوا تھا۔ ایک ہوتی ہے فتح اشخاص کی۔ یہ مادی
یقۂ جنگ کی ظاہری کامیابی ہے۔ مگر کربلا کی جنگ کی یہ خصوصیت
تھی کہ یہاں اشخاص نے اپنی ہستی کو اصول کے راستہ میں فنا
کر دیا تھا۔ یہاں فتح اور شکست کے معنی یہ نہ تھے کہ ایک فریق اپنی
ندگی کو برقرار رکھے اور دوسرے کو محکوم بنا لے بلکہ فتح و شکست
کی حقیقت یہ تھی کہ اصول برقرار رہے اور فریق مخالف کا مسلک
صول کو نیست و نابود ہو جائے۔

یقیناً سیدالشہداء نے حق و باطل کے اس معرکہ میں فتح حاصل
اور دائمی فتح۔ اور یزید کو شکست ہوئی اور انتہائی شکست۔

سیدالشہداء کے اصحاب کو اپنی حقانیت پر بھروسا تھا اور اس لئے
اپنے مقابل فوج کا سمندر موجزن دیکھ رہے تھے مگر ان کو کوئی ہراس
تھا۔ کتنی فوج تھی؟ بھلا اس کو کہاں بتایا جا سکتا ہے۔ یہ سمجھ لیجئے کہ
زیاد کی طرف سے اس کا اہتمام تھا کہ کوئی لڑنے والا سپاہی کوفہ
اندر باقی نہ رہ جائے۔ اس نے خود اتنے دنوں کے لیے اپنا
نخیلہ میں جو کوفہ کی آخری سرحد تھی نصب کرا دیا تھا اور وہیں سے
فوجوں کا معائنہ کر کے کربلا کی سمت بھیج رہا تھا۔ مگر کچھ ایسے لوگ تھے

جو ابن زیاد کے سامنے پیش ہو کر خفیہ طور سے واپس چلے جاتے تھے۔ جاسوسوں نے یہ خبر ابن زیاد کو پہنچا دی۔ اُس نے کوفہ میں منادی کرا دی کہ جو کوئی قتل حسینؑ کے لیے جانے سے گریز کرے گا اُس کا جان و مال حکومت کے لیے حلال ہو گا۔ لوگوں کے دکھانے کے لیے ایک شخص کو اہلِ شام میں سے جو کوفہ کسی ضرورت سے آیا تھا، سُولی بھی دلوا دی۔ اب کیا تھا لوگوں پر دہشت طاری ہو گئی اور سارا کوفہ کربلا کی طرف اُمنڈ آیا۔ کربلا کی زمین فوج کی کثرت سے سمندر کی طرح موجیں مار رہی تھی۔ اور یہ کس کے مقابلہ کی تیاری تھی؟ حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں کے۔ جن کی تعداد مشکل سے سو سے زیادہ ہو گی۔

ابن زیاد جانتا تھا کہ یہ کس بہادر خاندان کے لوگ ہیں۔ اُسے ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا اُس وقت جب مسلم بن عقیل کوفہ میں اکیلے تھے اور محمد بن اشعث پانچ سو آدمیوں کا لشکر لے کر آیا، اور شکست ہوئی۔ اُس نے مزید کمک منگوا بھیجی۔ ابن زیاد نے کہا کہ ایک تن تنہا کے مقابلہ کے لیے اتنی فوج کافی نہ تھی جو اب مزید فوج مانگی ہے۔ محمد بن اشعث نے کہلوا بھیجا کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے مجھے کوفہ کے کسی بقال کے مقابلہ کے لیے بھیجا ہے؟ ارے یہ لوگ خدا کی کھنچی ہوئی تلواریں ہیں ان سے مقابلہ کوئی آسان بات نہیں ہے۔

اسی چھائے ہوئے رُعب کا اثر تھا کہ حسینؑ کے مقابلہ میں پُوری طاقت صرف کرنی تھی۔ ایک طرف اس مختصر سی جماعت کے لیے تیس ہزار کا لشکر پھر اُس پر طرہ یہ کہ فرزند رسولؐ اور اُن کے اصحاب و انصار یہاں تک کہ

چھوٹے چھوٹے بچوں پر پانی بند کر دیا گیا۔ عرب کا ریگستان اور تپتی ہوئی ریگ اور اُس پر خیامِ حسینیؑ ہیں کمسن بچے اور ساتویں سے پانی بند۔

آپ ہی انصاف کیجئے کہ آج نویں تاریخ تک اُن کے پیاس کی طغیانی کا کیا عالم ہو گا۔ ابھی تک صلح کی گفتگو جاری تھی اور وُہ اس درجہ تک پہنچ گئی تھی کہ عمر سعد تک کو یقین ہو گیا تھا کہ اب معاملہ رفع دفع ہو جائے گا اور اُس نے ابن زیاد کو بہت اطمینان آمیز الفاظ میں یہ خط لکھا تھا کہ الحمدللہ فتنہ و فساد کی آگ خاموش ہو گئی۔ حسین بن علی تیار ہیں کہ وُہ مُلک عرب کو چھوڑ دیں اور کسی دُوسرے مُلک میں چلے جائیں۔ اُس کے نزدیک یہ ایسی بے ضرر تجویز تھی کہ اِسے ابن زیاد کو مان ہی لینا چاہیئے تھا۔ اور ابن زیاد بھی اس پر نیم راضی سا ہو گیا تھا۔ مگر شمرؔ جو موقع پر موجود تھا اُس نے کہا غضب کرتا ہے۔ حسینؑ کو قبضہ میں لا کر پھر نکل جانے کا موقع دیتا ہے۔ ابن زیاد کو بھی جوش آگیا اور اُس نے عمر سعد کو بڑا سخت خط لکھا، آج کی تاریخ یہ خط کربلا پہنچا اور صلح کی اُمید ختم ہو گئی۔

اس خط میں لکھا تھا کہ حسینؑ سے کسی صلح کی ضرورت نہیں ہے۔ وُہ یا تو اپنے کو میرے سپرد کر دیں اور یا قتل کیے جائیں۔ اسی پر اکتفا نہیں ہوئی۔ کیا بتاؤں اس کے بعد کیا لکھا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ عرب میں جس کی توہین انتہا کی منظور ہوتی ہے اُس کی لاش کو مثلہ کیا جاتا ہے یعنی اُس کے اعضاء کو جُدا کیا جاتا ہے۔ ظالم ابن زیاد لکھتا ہے کہ دیکھو قتل کے بعد حسینؑ کی لاش کو مثلہ کرنا اور اُن کی لاش پر گھوڑے دوڑانا"

حسینؑ اسی کے مستحق ہیں۔

کیا میں یاد دلاؤں کہ اس حکم کی تعمیل بعد شہادتِ حسینؑ کس طرح ہوئی بس یہ فقرہ زیارت کا پڑھ لیجئے۔

اَلسَّلَامُ عَلَی الْاَعْضَاءِ الْمُقَطَّعَاتِ۔

"سلام ہو ان اعضاء پر جو ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے"

یہ خط عمر سعد کو پہنچ گیا۔ نویں تاریخ کی شام نہیں ہونے پائی تھی کہ عمر سعد نے جنگ کی تیاری کر دی اور امامؑ پر حملہ کا حکم دے دیا۔

امامؑ عصر کے وقت خیمہ کے دروازہ پر تلوار کا سہارا لیے گھٹنوں پر سر رکھے بیٹھے تھے اور کچھ غنیدہ غلبہ تھا کہ گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز جناب زینبؑ کے کان میں گئی۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس بہن کو اپنے بھائی سے کس درجہ محبت تھی۔ حضرت زینبؑ بیتابانہ امام حسینؑ کے قریب آئیں اور کہا بھیا دیکھئے دشمن کے لشکر کی آواز بہت قریب سے آ رہی ہے حضرتؑ نے سر اٹھایا۔ فرمایا ابھی میں نے رسالتمآبؐ کو خواب میں دیکھا حضرتؐ فرماتے ہیں کہ تم عنقریب ہمارے پاس آؤ گے۔ بھلا زینبؑ اور حسینؑ کی زبان سے مرنے کی اطلاع سنتیں۔ آپ نے واویلا کیا اور دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ پیٹ لیا۔ امامؑ نے تسکین دی اور صبر و سکون کی ہدایت فرمائی۔

جناب زینبؑ امام کی زبان سے یہ خواب سننے کی تاب نہ لا سکیں مگر یہی زینبؑ تو تھیں جنہوں نے بعد عصر اس خواب کی تعبیر اپنی آنکھوں

سے دیکھی ہر طرف قتل الحسینؑ کی آوازیں آ رہی تھیں اور خیمہ کے دروازہ پہ گھوڑا حسینؑ کا خالی زین شان سے آیا کہ باگیں کٹی ہوئی ہیں، جا بجا تیر پیوست اور پیشانی خون سے رنگین۔ وہ بہن کو بھائی کی خبر شہادت دے رہا تھا۔ زینبؑ جب خیمہ سے نکلیں تو بابا بے تیغ کے بیچ رہے تھے سر حسینؑ نوک نیزہ پر تھا۔ زینبؑ رو رہی تھیں لَیْتَ السَّمَاءَ اَطْبَقَتْ عَلَی الْاَرْضِ کاش آج آسمان پھٹ کر زمین پر گر پڑتا۔ پھر رسولؐ سے خطاب کرکے کہتی تھیں۔ یا جدّاہ صلّی علیک ملیک السماء ہذا حسین مرمّل بالدماء مقطّع الاعضاء

اے نانا! اے رسولؐ خدا آپ پر تو فرشتے آسمان سے درود و سلام بھیجا اور آپ کا نواسہ حسینؑ زمین کربلا پر ہے اس طرح کہ جسم خون سے رنگین اور اعضاء ٹکڑے ٹکڑے ہیں۔

امامؑ کی گفتگو جناب زینبؑ سے دیر تک جاری رہی۔ حضرت چاہتے تھے زینبؑ کو آئندہ کی مصیبتوں کے مقابلہ کے لیے پہلے سے تیار کر دیں۔

آپ نے جناب زینبؑ کو [illegible] وصیتیں بھی کیں اور ہدایتیں بھی فرمائیں۔ روایت خاموش ہے مگر ممکن ہے حضرتؑ نے یہ بھی فرمایا ہو کہ اے زینبؑ تم کو ان بے کسوں کی قافلہ سالار بن کر شہر بہ شہر، اور دیار بہ دیار پھرنا ہوگا۔ ابن زیاد اور یزید کے دربار میں جانا پڑے گا۔ اے زینبؑ کل میری قربانی کا دن ہے جو میدان جنگ میں ہوگی۔ اور

اس کے بعد تمہیں اپنے پردہ کی قربانی دینا پڑے گی۔
میرے مقصد کی تکمیل تمہاری اس قربانی پر موقوف ہے۔

بہن بھائی کی باتوں میں دیر ہوئی۔ دشمن کا لشکر خیموں سے اور قریب آگیا ہوگا۔ حضرتؑ نے جناب عباس کو بلایا۔ فرمایا جاؤ اور ان سے دریافت کرو کہ اس وقت کے حملہ کا کیا سبب ہے؟ جناب عباس گئے اور واپس آکر عرض کیا کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ امیر ابن زیاد کا حکم آیا ہے کہ یا حسینؑ بیعت کریں اور یا پھر جنگ پر تیار ہوں۔ حضرتؑ نے فرمایا جاؤ اور اُن سے ایک شب کی مہلت مانگو۔ حضرت عباسؑ نے جاکر پیغام امامؑ کا پہنچایا۔ عمر سعد نے پہلے تو انکار کر دیا مگر پھر اپنے ہی فوج والوں کے اصرار سے مجبور ہوا اور مہلت دے دی۔

بس یہ ایک شب اور حُسینؑ دنیا میں مہمان ہیں اور ہمارے عزاخانوں میں تو آج ہی آخری مجلس ہے سمجھیے کہ آج ہی امام رخصت ہو رہے ہیں اس کے بعد یہ رونق عزاداری کی نہ رہے گی۔ پھر سال بھر جو زندہ رہے گا امام کی عزاداری آیندہ عشرۂ محرم میں کرے گا۔

اچھا سُنیئے آج کی شب امامؑ نے کیونکر بسر کی۔ یہ تمام شب امامؑ اور اُن کے اصحابؓ نے عبادت خدا میں بسر کی۔ راوی کا بیان ہے کہ لَهُمْ دَوِيٌّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ۔ اُن کی آوازیں تسبیح و تہلیل سے اُس رات کے سناٹے میں یُوں گونج رہی تھیں جیسے شہد کی مکھیوں

کی آواز آتی ہے۔

حضرتؑ نے اس شب اپنے اصحاب پر اتمام حجت کی اور اُن کی وفاداری کا امتحان لیا۔ یادگار ہے وُہ موقع کہ آپ نے اپنے تمام ساتھیوں کو جمع فرمایا۔ امام زین العابدین فرماتے ہیں کہ میں بیمار تھا مگر قریب چلا گیا کہ سنوں امامؑ کیا فرماتے ہیں۔ آپ نے ایک خطبہ فصیح پڑھا اور ارشاد فرمایا کہ میں نہیں جانتا کسی کے اصحاب کو جو میرے اصحاب سے زیادہ باوفا ہوں اور نہ کسی کے عزیزوں کو جانتا ہوں جو میرے عزیزوں سے زیادہ اطاعت شعار ہوں۔ خدا تم سب کو میری طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔ معلوم ہونا چاہیے کہ کل کا دن فیصلہ کن ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ تم سب لوگ چلے جاؤ خوشی کے ساتھ میری جانب سے تم پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ میں اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے اُٹھائے لیتا ہوں۔ رات تاریک ہے اس کو غنیمت سمجھو اور یہاں سے جلدی نکل جاؤ۔

اس کے بعد شاید حضرت کو خیال ہُوا کہ ممکن ہے اصحاب اس میں غیریت کا پہلو محسوس کریں اور اس کا ان کو صدمہ ہو۔ حضرت نے عجیب حسرت کا کلمہ ارشاد کیا فرمایا میرا مطلب اس سے یہ بھی ہے کہ تم میں سے ہر ایک میرے ایک ایک عزیز کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے جائے کہ میری جان تو جائے ہی گی یہ لوگ کسی طرح محفوظ رہ سکیں۔

یہ سُننا تھا کہ پُورے مجمع میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ مگر اصحاب و انصار پاس ادب سے خاموش رہے۔ سب سے پہلے جس کی آواز بلند ہوئی وُہ قمر بنی ہاشم ابوالفضل العباس تھے اور آپ کے ساتھ سب بھائیوں اور بھتیجوں اور دُوسرے عزیزوں نے کہا کہ کیوں ہم کس لیے ایسا کریں؟ کیا اس لیے کہ آپ کے بعد زندہ

رہیں ؟ خدا ہم کو یہ روزِ بد نہ نصیب کرے۔

اس کے بعد اصحاب کی باری آئی۔ سب سے پہلے بوڑھے مجاہد مسلم بن عوسجہ کھڑے ہوئے۔ آپ نے رُخ کیا امامؑ کی طرف اور کہا "بھلا ہم آپ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ خدا کی قسم میں ان دشمنوں سے نیزہ کے ساتھ جنگ کروں گا یہاں تک کہ میرا نیزہ اُن کے سینوں میں ٹوٹ جائے اور تلوار لگاؤں گا جب تک کہ اُس کا قبضہ میرے ہاتھ میں ٹھہر سکے اور میں آپ سے کسی طرح جُدا نہ ہوں گا۔ اگر ہتھیار نہ ہوں گے کہ جن سے جنگ کروں تو میں انہیں پتھر ماروں گا اور آپ کی حمایت کرونگا یہاں تک کہ آپ کے قدموں پر اپنی جان نثار کر دونگا۔ اسی طرح کی تقریریں دُوسرے مجاہدین نے کیں میں مسلم بن عوسجہ کو مبارکباد دیتا ہوں اُن کے عزم و ارادہ پر مگر میں کہوں گا کہ آپ کی جرأت و شجاعت ایسی نہ تھی کہ کبھی آپ کے ہاتھ سے تلوار کا قبضہ جُدا ہو جائے آپ کو یہ نوبت نہیں آئی کہ آپ اپنے دشمنوں پر پتھروں سے حملہ کریں مگر آپ کے آقا حسینؑ پر ہر طرح کے حربے لگائے گئے۔ تلوار تیر اور نیزے ہی کیا کم تھے کہا جاتا ہے کہ کچھ اشقیا جھولیوں میں پتھر بھرے ہوئے تھے اور امامؑ کی جانب پھینک رہے تھے۔

عزادارانِ حسینؑ! اُس وقت جب امامؑ زخموں سے چُور ہو رہے تھے تو ایک پتھر ایسا آیا جو حضرتؑ کی پیشانی پر لگا جس سے خون جاری ہوا اور چہرہ پر آنے لگا۔ امامؑ نے قبا کے دامن کو اُٹھا کر چاہا کہ خون پیشانی سے پاک کریں، اس وقت ایک تیر ایسا آیا جو قلب مبارک پر لگا۔ امامؑ نے اُس تیر کو پُشت کی طرف سے نکالا جس سے خون مثل پرنالے کے جاری ہوا اس نے امامؑ کی تمام قوت ختم کر دی۔ اس کے بعد زبان میں طاقت نہیں۔ ایک نیزہ ایسا لگا جس سے

بلند مرتبہ شاہے ز صدر زیں افتاد　　اگر غلط نہ کنم عرش بر زمیں افتاد

امامؑ پر پتھروں سے حملہ کی انتہا آپ کی زندگی پر بھی نہ ہوئی، بعد شہادت۔ کیا یاد دلاؤں کوفہ کا بازار، ایک مکان کا برآمدہ۔ سنگِ جفا اور حسینؑ کا سر۔ چاہنے والی بہن سامنے دیکھ رہی تھی۔ زینبؑ نے اپنا سر چوب محمل پر دے مارا اس طرح کہ خون جاری ہوا کہتی تھی اے چاند میری ماں کے ابھی تو تو کمال کو بھی نہ پہنچا تھا کہ کس قدر جلد گہن لگ گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ!

مجلس دہم

محرم کی دسویں تاریخ

قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ فِیْ کِتَابِہِ الْمَجِیْدِ فَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ ۝

آیت ہے قرآن مجید کی۔ ارشاد ہوتا ہے کہ "جلد معلوم ہو جائے گا اُن لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا کہ کیسا انجام اُن کا ہوتا ہے"۔

الفاظ آیت کے عام ہیں۔ یہ آیت کسی خاص جماعت سے مخصوص نہیں ہے۔ مگر کوئی شبہہ نہیں کہ لفظا اپنے کامل مصداق کی طرف خود سے مڑ جاتی ہے۔

ضرور اگر ظلم کے مختلف درجے ہیں اور اُن میں شدت اور خفت

کے اعتبار سے فرق ہے تو آیت کی نگاہ بھی اوّل درجے کے ظلم کرنے والوں پر پہلے ہے اور معمولی ظالموں پر اُن کے بعد۔ یوں تو ہر گناہ ظلم ہے۔ ارشاد ہوا ہے وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ مگر وُہ معاصی جو براہِ راست خدا سے متعلق ہیں اُن میں عفوِ الٰہی کا موقع ہے اور خدا غفور و رحیم ہے، اُن کی طرف اتنی سخت تہدید کا رُخ نہیں معلوم ہو رہا ہے۔

یہاں انداز کلام بتلاتا ہے کہ خطاب کا رُخ ایسے سرکش افراد کی طرف ہے جو اپنی وقتی طاقت و قوت کے گھمنڈ میں کمزور انسانوں کو ستاتے اور تکلیفیں پہنچاتے ہیں وُہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی دُنیا ایک ہی حال پر رہے گی۔ زمانہ ہمیشہ اُن کے ساتھ سازگار رہے گا اور آج کی شام کے لیے کوئی صبح نہیں ہوگی۔ آیت ان لوگوں کو متنبہ کرتی ہے کہ انہیں اپنی موجودہ طاقت پر مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ انہیں معلوم ہوگا کہ زمانہ کا انقلاب کس طرح ان کے ظلم کی پاداش دیتا ہے وُہ سر جو آج غرور کی وجہ سے اونچا ہے ایک دن زمین پر ٹھوکریں کھاتا ہوگا۔ اور وُہ جنہیں آج نشانہ ظلم بنایا جا رہا ہے۔ دُنیا میں زندگی حاصل کریں گے۔ ایسی زندگی جس کی مدت طولانی ہے اور جو ختم ہونے والی نہیں ہے۔

دُنیا میں طاقت کی ستمگاریاں ہمیشہ جاری رہی ہیں اور زمین مظلوموں کے خون سے اکثر لالہ زار بنی ہے۔ مگر یاد رکھیے کہ کچھ ظلم خاص اشخاص پر ہوتے ہیں اور افراد کی زندگی ختم کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ان کی پاداش اُن کے اعتبار سے ہے۔ اور کچھ مظالم کسی بلند مقصد کے فنا کرنے کیلئے ہوتے ہیں اُنکا مقصد

اشخاص کی زندگی کا فنا کرنا نہیں ہوتا بلکہ اصولوں کا فنا کرنا جن سے نوعِ انسانی کی زندگی وابستہ ہے۔ اشخاص یہاں صرف اس لیے حلال ہو جاتے ہیں کہ وُہ اُن مقاصد کی سپر بنے ہوئے ہیں۔ یہ ظلم بہت عظیم ہوتا ہے اور اس کے نتائج بھی زیادہ ہولناک ہوتے ہیں۔

انبیاء و مرسلین پر جو مظالم ہوتے رہے ہیں اُن کی نوعیت یہی ہے۔ زکریاؑ، جرجیسؑ اور یحییٰؑ سب حق کے مجسمے تھے جنہیں موت کا ساغر پلایا گیا۔ حضرت عیسےٰؑ کو بھی سُولی چڑھانے کی کوشش کی گئی۔ سب کے آخر میں حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی طرح طرح کی تکلیفوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مگر یاد رکھیے کہ ان میں سے کوئی بزرگ ایسا نہ تھا جس کا لقب ہی مظلوم قرار پا گیا ہو۔ یہ خصوصیت تو حضرت سیدالشہداءؑ کی ہے۔ اُن پر کربلا میں کچھ ایسے مظالم ہوئے کہ اُن کا لقب ہو گیا "مظلومِؑ کربلا"۔ اسی بناء پر جب ایک معصوم کے سامنے تذکرہ ہُوا تو آپ نے فرمایا کہ "کیا ہے کوئی مظلوم دُنیا میں سوائے حسینؑ بن علیؑ کے" اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مظلومیت نے اپنی اہمیت کی بنا پر دُنیا کے مظلوموں کا ذکر کالعدم کر دیا۔

اور یہ حقیقت ہے کہ کربلا کے اس مظلومؑ پر جو مصائب پڑے اُن کی مثال تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔

جس جس نبی اور رسُول پر ظلم ہُوا وہ اُن کی ذات سے مخصوص تھا۔ انہیں تلوار سے قتل کیا گیا، سُولی پر چڑھا دیا گیا، آرے سے چیرا گیا، یا کسی اور طرح سے ایذا پہنچائی گئی مگر کسی نبی اور رسُول کے ساتھ اُن کے عزیز واقارب

قتل نہیں ہوئے۔ یہ خصوصیت صرف حضرت سیّد الشہدا کی ہے۔ آپ کے ساتھ آپ کے عزیز و اقارب کیسے دل کے ٹکڑے موجود تھے۔ ایک طرف علی اکبرؑ ایسا کڑیل جوان اور دوسری طرف عبداللہ رضیع ایسا شیر خوار بچہ۔ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں ملنا غیر ممکن ہے۔

کسی نبی و رسول کے ساتھ موردِ امتحان میں اُن کے اہلِ حرم نہیں تھے مگر فرزندِ رسولؐ کے ساتھ پردہ نشین بی بیاں بھی موجود تھیں۔

دشمنوں کے مظالم کا سیلاب تھا جو حسینؑ اور اُن کے ساتھیوں پر چھا گیا تھا۔ کربلا میں فرزندِ رسولؐ کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ ایک مظلوم کے قتل کے لیے ہزاروں تلواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ اس ایک رات کی مہلت ہی بہت مشکل سے دی گئی تھی۔ عاشور کی صبح قیامت کی صبح تھی۔ بیبیاں اپنے وارثوں کی زندگی سے نا امید ہو چکی تھیں۔ مائیں اپنے بچوں کے چہرہ کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھ رہی ہوں گی کہتی ہوں گی کہ تھوڑی دیر میں یہ چاند سی صورتیں خاک میں مل جائیں گی۔

امامؑ نے اپنے اصحاب کے ساتھ نمازِ صبح بہ جماعت ادا کی۔ تاریخ میں اگرچہ اس کی صراحت نہیں ہے مگر مشہور ہے کہ آج کی اذان جناب علی اکبرؑ نے دی تھی؛ دل کہتا ہے کہ ایسا ضرور ہُوا ہوگا اس لیے کہ علی اکبرؑ جب رخصت آخر کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو امامؑ نے فرمایا کہ خداوندا یہ بچہ صورت و سیرت اور گفتار میں تیرے رسولؐ سے مشابہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علی اکبرؑ کی صدا پیغمبرؐ کی آواز سے مشابہ تھی۔ پھر کیا تعجب ہے کہ حسینؑ نے آج علی اکبرؑ

ہی کو اذان کے لیے مامور کیا ہو۔ ایک طرف تو اس لیے کہ اہلِ حرم آخری بار رسولؐ کی آواز سن لیں اور دوسرے اس لیے کہ نام نہاد مسلمانوں کو جو آپ کے قتل پر تیار ہوئے ہیں رسولؐ یاد آجائیں انہیں احساس ہو جائے کہ جن کے ذبح کرنے کو تلوار اٹھائی ہے یہ رسولؐ کی آخری یادگار ہیں۔

یہ زمانہ کا انقلاب تھا کہ رسولؐ کے کلمہ گو خود انہی رسولؐ کے فرزند کو قتل کرنے جمع ہوئے تھے اور وہ اپنے تئیں مسلمان سمجھ رہے تھے اس لیے انہوں نے صبح کی نماز بھی پڑھی مگر اس کے بعد بانیؐ اسلام کے فرزند کا خون بہانے میدان میں آگئے۔

فوج مخالف میں صف بندی ہوئی اور امام حسینؑ نے بھی اپنے چھوٹے سے لشکر کو ترتیب دیا۔ میمنہ پر زہیر بن قین، میسرہ پر حبیب بن مظاہر اور علم فوج کا اپنے بھائی قمر بنی ہاشم ابو الفضل العباس کو دیا۔

اس کے پہلے امامؑ ہر طرح اتمام حجت کر چکے تھے مگر پھر آخری مرتبہ حضرتؑ نے حجت تمام کر دینا چاہی۔ آپ نے ایک ناقہ طلب فرمایا اس پر سوار ہوئے، قرآن منگا کر اپنے سامنے رکھا اور صفوف دشمن کے سامنے آکر ایک فصیح و بلیغ تقریر شروع کی۔ امامؑ کی آواز جو خیمہ میں پہنچی تو اہلِ حرم سے گریہ کا شور بلند ہوا۔ حضرتؑ نے جناب عباسؑ و علی اکبرؑ کو بھیجا کہ انہیں خاموش کریں رونے کا وقت تو اس کے بعد آئے گا۔

میں عرض کروں گا اے آقا جتنا رو ئیں رو لینے دیجیے اس کے بعد تو پھر ان بے کسوں کو رونے کا موقع بھی نہ دیا جائے گا۔ جب ان کے رونے کا وقت آیا تب دشمنوں کے ہاتھوں میں قید ہو گئیں۔ ظلم و ستم کی انتہا تھی کہ اگر کسی کی آنکھ سے آنسو نکلتا تھا تو نوک نیزہ سے اذیت دی جاتی تھی۔

امامؑ کے موعظہ کا فوجِ مخالف پر کوئی اثر نہ ہوا۔ امامؑ نے قرآن ہاتھوں پر لے کر گویا یہ تبلایا کہ قرآن میرے ساتھ ہے۔ ابھی ان ہاتھوں پر دشمن کی فوج کے سامنے قرآن بلند ہو رہا تھا۔ نہ سہی اس کا کوئی اثر، مگر غنیمت ہے کہ قرآن پر کوئی تیر نہیں لگایا گیا۔ مگر آج ہی عصر کے پہلے وُہ وقت آیا جب امامؑ نے انہی ہاتھوں پر قرآنِ ناطق کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بلند کیا۔ کون؟ وُہ بے زبان، معصوم بچہؑ جو پیاس سے جاں بلب تھا۔ حرملہ لعنہ سے یہ دیکھا نہ گیا۔ چلّہ کمان میں ایک تیر جوڑ کر بچّہ کے گلے پر لگایا، وُہ معصومؑ آغوشِ پدر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اِنّا لِلّٰہ۔

امامؑ کی یہ کوشش امن کے قائم رکھنے کے لیے رائیگاں گئی۔ حضرتؑ کی تقریر کا فوجِ مخالف نے کوئی اثر نہ لیا۔ مگر حجت خدا نے اپنا فرض ادا کر لیا آپ نے حکم دیا کہ ناقہ کو لے جائیں کیونکہ یہ تو صلح کی سواری ہے۔ اب جنگ کا ہنگام آ گیا تھا اس لیے آپ نے گھوڑا طلب فرمایا اور سوار ہوئے مگر ابتداء بجنگ کرنا آپؑ کی شان کے خلاف تھا دھوپ چڑھ گئی تھی، دن کا تھوڑا حصّہ گزر گیا تھا جب عمر سعد نے تیر چلّہ کمان میں جوڑا اور لشکرِ امامؑ کی طرف رہا کیا۔ پکار کر کہنے لگا گواہ رہنا کہ سب سے پہلا تیر حسینؑ کی طرف میں نے ہی لگایا ہے۔ اس کے ساتھ ہزاروں تیر ایک ساتھ رہا ہو گئے۔ کیا تیروں کی اس بارش سے امامؑ کے ساتھیوں میں کوئی اضطراب پیدا ہوا؟ ہرگز نہیں۔ وُہ حکمِ امامؑ کے منتظر تھے۔ حضرتؑ نے ارشاد فرمایا:۔ قُومُوا فَقَدْ اَتَاکُمْ بَرِیْدُ الْقَوْمِ۔ "اُٹھو بہادرو قاصدِ فوجِ مخالف کے تمہاری جانب آ گئے"۔

مطلب یہ ہے کہ ابتدا جنگ کی دشمن کی طرف سے ہو گئی۔ یہ تیر ہنگام حرب ہیں، اب ہمارا کام ہے حفاظتِ خود اختیاری کے لیے جہاد کرنا۔

سمجھ لیجئے کہ یہی ایک تیر تھا جس میں کربلا کے تمام مظالم مضمر تھے۔ امامؑ کے مقابلہ میں کربلا میں تیروں کا بڑا استعمال کیا گیا۔ یوں تو ہزاروں ہی تیر پھینکے گئے مگر واقعہ کربلا میں چند تیر یادگار ہیں۔

پہلا وہی تیر جس نے رباب کی گود خالی کی۔ امام نے بے شیر کا خون اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور چلو آسمان کی طرف پھینکا اور کہا جو کچھ خدا کی راہ میں مجھ پر گزرے سب آسان ہے۔

دُوسرا تیر وُہ تھا جب امامؑ خود تین دن کی بھوک پیاس میں مصروفِ جہاد تھے۔ دل پر بہتّر داغ۔ کمر عباسؑ کے مرنے سے شکستہ۔ آنکھوں کا نور علی اکبرؑ کے ساتھ رُخصت ہو چکا تھا۔ مگر پھر بھی حسینؑ میدانِ جنگ میں علیؑ ابنِ ابی طالبؑ کی شان سے جہاد کر رہے تھے۔ تاریخِ طبری کے الفاظ ہیں، راوی کا بیان ہے:

مَا رَأَيْتُ مَكْثُوْرًا قَطُّ قُتِلَ اَصْحَابُهٗ وَاَوْلَادُهٗ اَرْبَطُ جَاشًا مِنَ الْحُسَيْنِؑ۔

"مَیں نے کوئی زخمی نہیں دیکھا جس کے ساتھی قتل ہو گئے ہوں، اور اولاد کام آگئی ہو اور باوجود ان تمام مصائب کے وُہ حسینؑ سے زیادہ مطمئن نظر آتا ہو۔"

اس عالم میں ایک تیر آیا جو حلقوم مبارک پر لگا۔ امامؑ نے تیر کو کھینچ کر

پھیلا اور اپنے دونوں ہاتھ حلقوم کے نیچے لگا دیئے۔ جب وہ بھر گئے تو اُسے بھی آسمان کی جانب پھینک دیا۔

جنگِ اُحد میں جنابِ رسالت مآبؐ زخمی ہو گئے تھے اور چہرہ مبارک خون آلودہ تھا تو امیرالمومنینؑ سپر میں پانی لائے تھے۔ سیدۂ عالم نے زخموں کو اپنے ہاتھ سے دھلایا تھا۔ کربلا میں ایک تو پانی تھا کہاں۔ جو حسینؑ کے زخم دھلائے جاتے۔ پھر کوئی یار و مددگار موجود نہ تھا۔ حسینؑ کی بیٹی خیمہ میں ضرور موجود تھی مگر وہ ہجوم اعدا میں باپ تک کیا پہنچ سکتی تھی۔ پھر اسے حسینؑ کی ہدایت تھی کہ یا خود اہلِ حرم کی فرض شناسی کہ جب تک یہ خبر خیموں سے نکلنے پر مجبور نہیں ہوئی کوئی بی بی خیمہ سے باہر نہیں نکلی۔ بے شک جب حسینؑ شہید ہو گئے اور دشمنانِ دین خیموں کو لوٹنے آئے تو مجبوراً بیبیاں سراسیمہ و مضطرب ہو کر خیموں سے برآمد ہوئیں اسی طرح کہ ناشرات الشعور لاطمات الخدود یعنی بال بکھرے ہوئے منہ پر طمانچے لگاتی ہوئی۔

عزادارانِ حسینؑ کا دل پھٹا جاتا ہے۔

تیسرا تیر وہ تھا کہ جب تمام بدنِ امامؑ کا جسم زخموں سے چور ہو چکا تھا۔ یہ تیر امامؑ کے قلب مبارک پر لگا جس کو حضرت نے پشت کی طرف سے کھینچا۔ روایت میں یہ فقرہ وارد ہوا ہے: فانبعث الدم کالمیزاب۔ خون اس طرح جاری ہوا جیسے پرنالے سے پانی بہتا ہے۔

یہ خون کیا بہا کہ امامؑ کی طاقت سلب ہو گئی۔ افسوس اس پر بھی

ریاض المصائب (جدید)

مصنفہ عمدۃ الذاکرین عالیجناب مولانا سید ریاض الحسن صاحب قبلہ :- یہ کتاب مدت سے بالکل نایاب تھی مومنین کے بیحد اصرار پر یہ قابلقدر مجموعہ مولوی سید بشارت حسین صاحب کامل مرزاپوری کربلائی مشہدی نے نظرثانی کرنیکے بعد اس کو شائع کیا گیا ہے۔ اس میں آیاتِ قرآنی اور احادیث نبویہ کے ذیل میں قافلہ حسینی کی مدینہ سے روانگی، کربلا میں وُرود، شہادت حضرت مسلمؑ، شہادت وہب کلبی، شہادتِ شہزادہ قاسمؑ، حالات شبِ عاشور، شہادت حضرت عباسؑ، شہادت شہزادہ علی اکبرؑ، شہادت شہزادہ علی اصغرؑ، شہادت سید الشہداءؑ، اسیری اہلِ حرم، مصائبِ کوفہ و شام، نیز فضائل و شہادت جناب امیرؑ، جناب سیدہؑ سے ربط، مصائب آلِ عبا کے متعلق انیس مجالس درج ہیں۔ اندازِ بیان موثر، زبان آسان اور عام فہم، بیان فضائل ایمان افروز اور ذکرِ مصائب درد انگیز و رقت خیز ہے۔ مومنین اور مقررین کے لئے نادر تحفہ۔ حجم ۱۹۲ صفحات سائز ۵ × ۷ لکھائی چھپائی عمدہ، ٹائیٹل رنگین خوبصورت۔ ہدیہ مناسب۔

انتخاب المجالس مرتبہ:- جناب مرزا سجاد حسین صاحب ایم۔ کام۔ یہ لاجواب کتاب ملکِ ہند و پاک کے علمائے متقدمین کے بلند پایہ مواعظ کا ایک زرین مرقع ہے جو نو مجالس پر مشتمل ہے۔ کتابت و کاغذ عمدہ۔ آفسٹ چھپائی۔ سائز ۵ × ۷ رنگین ٹائیٹل۔ ہدیہ مناسب۔

ملنے کا پتہ :-

امامیہ کتب خانہ مغل حویلی۔ اندرون موچی دروازہ۔ لاہور ۸
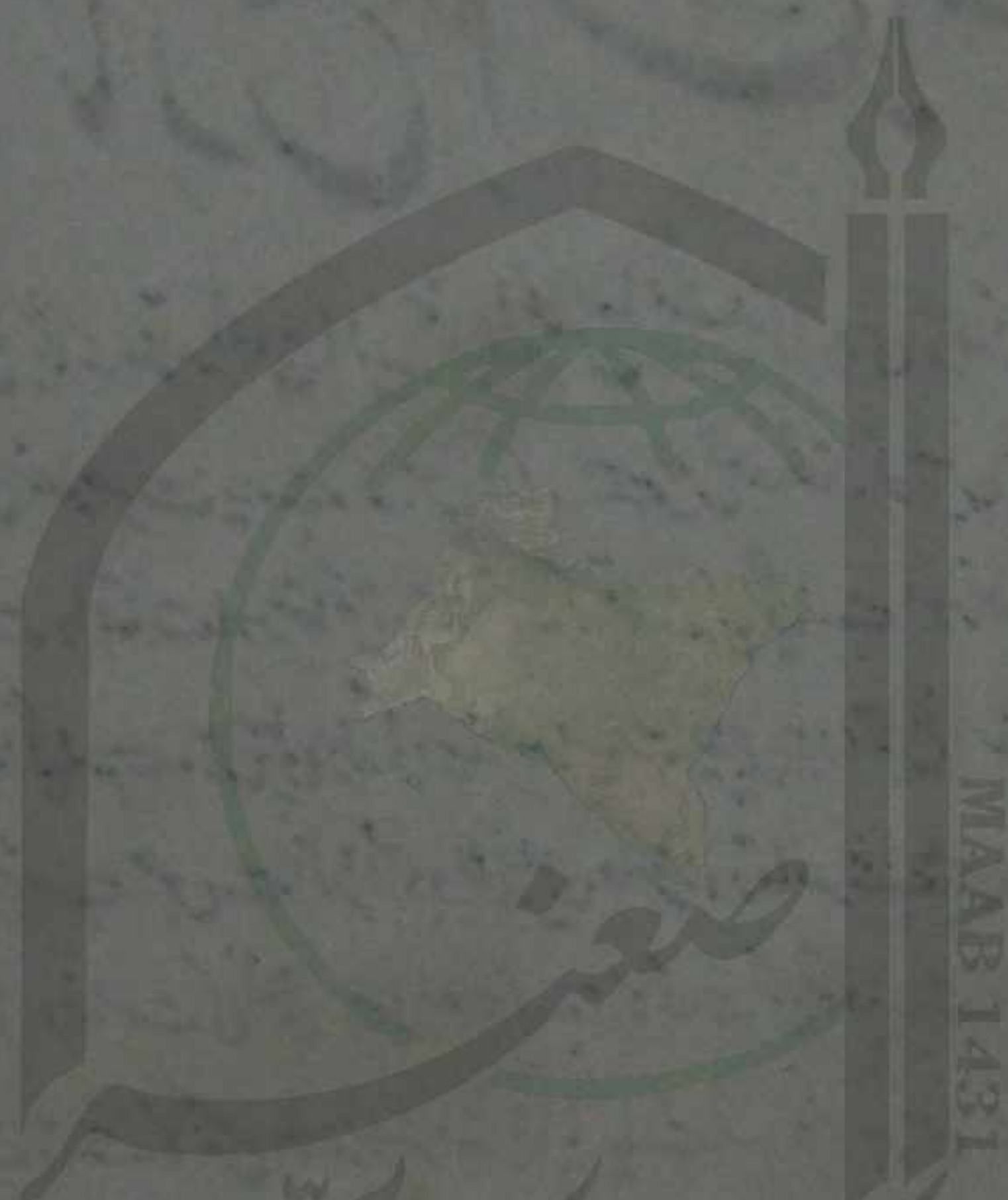
کتب تواریخ میں ایک عظیم الشان اضافہ

تاریخ اسلام جلد اول

مؤلفہ مؤرخ یگانہ علامہ الحاج السید نجم الحسن صاحب قبلہ کراروی مدظلہ العالی پشاور

اس تاریخ اسلام کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے لکھنے میں شیعہ نقطہ کو پیش نگاہ رکھا گیا ہے۔ اور صحیح تاریخی حالات واقعات اور حقائق و محققات کو قلمبند کیا گیا ہے اور قلم کی روانی کو تعصب کی سطح سے بلند رکھا گیا ہے۔ اس پہلی جلد کی چند خصوصیات یہ ہیں (۱) تاریخ اسلام کے مرکز اور اسکی بنیاد کی نشاندہی کی گئی ہے جس سے اکثر اردو مؤرخین عاجز اور قاصر رہے ہیں (۲) نور کی خلقت اور شیعیت کی بنیاد کی وضاحت کی گئی ہے (۳) خلقت کائنات کی تفصیلات پر روشنی ڈالی گئی ہے (۴) نسل آدم کے بڑھنے کا صحیح انداز و طریقہ بتایا گیا ہے۔ (۵) ہر نبی کے مفصل حالات لکھنے کے بعد اس امر کی مکمل وضاحت کی گئی ہے کہ ہر نبی نے حکم خدا سے اپنی زندگی میں اپنا جانشین مقرر کیا ہے اور کسی نبی نے اپنی جانشینی کو اپنی اُمت کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا اور اس کے شواہد پیش کیے گئے ہیں۔ حجم ۷۱۲ صفحات۔ سائز $\frac{۲۰\times۲۶}{۸}$۔ کتابت طباعت و کاغذ عمدہ سرورق رنگین پانچ رنگ میں۔ قیمت قسم اول سفید کاغذ مجلد

قسم دوم اخباری کاغذ مجلد

ملنے کا پتہ

امامیہ کتب خانہ مغل حویلی

اندرون موچی دروازہ۔ لاہور نمبر ۸

نوروز پرنٹنگ پریس اردو بازار لاہور